

قرآن کا مطالعیت کیسے ہے؟

انہ:

حضرت مولانا محمد اوسیں نگرامی ندوی

شیخ التفسیر ارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ،

مجلس نشریاتِ اسلام

۱۔ کے۔ ۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد۔ کراچی ۹۶۰۰

قرآن کا مطالعہ کیسے؟

ان:

حضرت مولانا محمد اوس نگرامی ندوی
شیخ التفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ،

مجلس شریاتِ اسلام
ا۔ کے۔ ۳ ناظم آبادینشن۔ ناظم آباد کراچی ۱۹۶۰ء

پاکستان میں جملہ حقوق طباعت و اشاعت
بجٹ نفضل بری ندوی محفوظ ہیں

انتساب

حضرت الاستاذ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

کے نام

جن کی توجہات عالیہ نہیں رے اندر قرآن مجید کا

ذوق پیدا کیا

اللہ تعالیٰ استاذ مرحوم کو اپنی بحاساب جتوں سے سرفراز فرمائے۔

اویس ندوی

نام کتاب	قرآن کام طالع کیسے ؟
تصنیف	مولانا محمد ادیں نگاری ندوی
طباعت	شیکل پر شنگ پریس کراچی
اشاعت	۱۹۹۸ء
ضخامت	۶۶ صفحات
ٹیلیفون	۴۲۱۸۱۶

ناشر
فضل بری ندوی

مجلس نشریاتِ اسلام، کے۔ ناظم آباد مینشن، ناظم آباد کراچی۔“

پیش لقط

اذہ۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی (صاحب تفسیر اجادی) رحمۃ اللہ علیہ

تلادت قرآن مجید اگر محض بے غرض اجر و ثواب فقط ناظر ہے جب بھی اس کے کچھ ادب اور قاعدے ہیں اور اگر قرآن فہمی بھی کسی درجہ میں مقصود ہو تو یہ آداب و قواعد ظاہر ہے کہ اہم تر ہی وجایں گے اور ان کی فہرست بھی خاصی طویل ہو جائے گی۔

سب سے مقام شرط تو پڑھنے والے کے قلب کا بربط و تعلق قرآن مجید کے ساتھ ہے تلاوت کے وقت جس درجہ قلب میں خشیت خشگی ہو گی یا پھر شوق و نشاط ہو گا اور جس حد تک اس کے کلام آہنی ہونے کا استحضار ہو گا اسی نسبت سے وہ اس خزانہ بہایت سے فیض حاصل کرے گا اور اسی درجہ میں اس پر اس کتاب حکیم کے معنی و مطلب دوسرا رکھتے رہیں گے تقویٰ و طہارت جس درجہ میں بھی اپنے سے بن پڑے۔ فہم قرآنی کی اولین ولازی شرط ہے۔ سرتاسر خلاف شریعت زندگی رکھنے والے اور اپنے کو دانستہ فتن و فجور میں غرق رکھنے والے پر قرآن قیامت تک نہیں کھل سکتا۔ اس سے نیچے مرتبہ میں کچھ اور بھی شرطیں مثلاً عربیت سے اقتیت عام دینی تعلیم و تربیت۔ تاریخی پس منظر یعنی نزول قرآن کے وقت منکرین و مومنین دونوں کے طرز زندگی عادات و حالات سے متعلق معلومات دوسری ملتوں کے عقائد و اعمال پر نظر وغیرہ۔

ضرورت تھی کہ اس کتاب الہی سے مستفید ہونے والوں کیلئے کوئی بہایت نامہ کسی صاحب فن کے قلم سے موجود ہوتا۔ دلی مسرت اس امر کے اظہار میں ہے کہ اس فروخت کو ایک ندوی فاضل اور اہل قلم نے پورا کر دیا۔ وہ بھی نہیں کہ دارالعلوم ندوہ میں فن تفسیر کے استاد اور سالہا سال کا تجربہ درس قرآن کا رکھتے ہیں بلکہ اپنے ذوق و جدان کے لحاظ سے صحیح معنی میں قرآنیات کے عالم و متعلم ہیں۔ ان کا مطالعہ اس ہاں میں بڑا وسیع اور ان کی نظر اس خصوصی میں مشارک اللہ گھری ہے ”ذلِّیلَ فَضْلُّ اللَّهِ يُوْتَیْهُ مَنْ يَشَاءُ“

ابن قیمؒ کی تفسیر انہیں نے بہت سی کتابوں کو کھنگال کر اور بڑی دیدہ ریزی سے التقااط کر کے مرتب و شائع کی ہے اور حشیتوں سے بھی اپنے کو خدمت قرآن کیلئے وقت کے ہوئے ہیں۔ ان کی یہ کتاب گو منقربے پھر بھی اپنے موضوع پر کافی ہے اور ان کی فہرست خدت اور قرآنی میں ایک منقول و معتقدہ اضافہ ہے۔

عبدالماجد دریا آبادی

بارہ بیکی

۱۹۶۵ ستمبر ۲۳ء

دوسرگروہ وہ ہے جو اپنے ذہنوں میں اسلام کا خود ایک تصور رکھتا ہے، اُس کے پاس کچھ خود ساختہ خاکے اور اپنے بنائے ہوئے نقشے ہیں۔ یہ گروہ قرآن کی آیات کو اپنے انہیں تصورات کی روشنی میں دیکھنا چاہتا ہے اور اسلام کے نظام حیات کو انہیں خاکوں اور قشوں کے مطابق مرتب کرنا چاہتا ہے! مختصر کہ یہ لوگ اپنی فلکو قرآن کا پائندہ نہیں کرنا چاہتے ہیں بلکہ قرآن کو اپنی فلک کا بایند کرنا چاہتے ہیں۔

یہ دونوں طبقے بڑے ہی حرماء نصیب ہیں۔ ان کو غور کرنا چاہیے کہ قرآن مجید جس سے ہم نے اپنی سیہنگتی کی وجہ سے منہ موڑ لکھا ہے جس کو ہم نے غلط طریقوں سے سمجھنے کی کوشش کی ہے دلخیقت یہی وہ نہنجز کہیا ہے جس کے استعمال سے قراق و رہن، ہجرتیل ایں کے اسرار کے ایں وہم رازین گئے تھے یہی وہ کچھ گرامایہ ہے، جس کو پاک بادی نہیں نہ کی نگاہوں میں لعل و گوہر خوف ریزوں سے زیادہ قیمت نہ رکھتے تھے یہی علم و حکمت کا وہ بیش بہا خزانہ ہے کہ بڑے بڑے عقول روزگار کو اسی کی رہنمائی کے سہارے اپنی زندگی کی منزلا کو طے کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا اور اُس کے حکیمانہ نظریات کے مقابلہ میں اپنی محدود عقل و خروکی شکست کے اعتراض ہی میں ان کو لذت محسوس ہوئی۔ اس لئے ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے رُخ کو اسی قبلہ مقصود کی طرف موڑا جائے۔ اس آہرے رم خوردہ کو پھر سوئے حرم لے جایا جائے اور اس مقدس آسمانی صحیفہ کی وساطت سے اپنے بخت خفتہ کو کچھ بیدار کیا جائے۔ آئندہ سطروں میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا اصل مقصود یہی ہے کہ مسلمانوں کو قرآن مجید سے استفادہ کی طرف متوجہ کیا جائے اور ان کو اس راہ کی مشکلات سے بھی آگاہ کیا جائے اور وہ طریقہ بتلایا جائے جس سے در مقضود ہاتھ آئے اور منزل م طلب تک رسائی ہو۔ ہماری معروضات کو پڑھ کر شبہ ہو سکتا ہے کہ ہم نے قرآن مجید سے استفادہ کو قیودوں

حروف آغاز

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ یہ اس کا پہلا وحیقی شرف ہے۔ دوسرا شرف یہ ہے کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے جلیل القدر نبی کے پیڑ داس کی تعلیم تشریع اور تذکیر کا کام ہوا، ان نسبتوں کی عظمت اور بلندی کا تقاضا یہ تھا کہ قرآن مجید ہماری توجہات کا مرکز بن جانا اور زندگی کے تشیب و فراز میں اسی کی رہنمائیاں ہمارے لئے مشعل راہ بنتیں

مگر

افسوس کا مقام ہے کہ مسلمانوں کا ایک بڑا حصہ اس مقدس صحیفہ کے مضامین و مطالب سے نا آشنا ہے اور صدمہ پر صدمہ یہ ہے کہ اس دوری و مجموعی پر ان کو کچھ افسوس بھی نہیں ہے۔ ان کو بھول کر یہ بھی خیال نہیں آتا ہے کہ ان کی میزوں پر الماریوں میں اور گھروں کے طاقتوں پر قرآن مجید کے جو نسخے رکھے ہوئے ہیں وہ اپنے اندر کوئی پیغام بھی نہ کھتے ہیں، زندگی کے مسائل کا، ان کے پاس کوئی حل ہے اور وہ ایک خاص دعوت کے داعی اور منادی ہیں۔

شرائط کے ذمہ بھت ہی محدود کر دیا ہے لیکن اللہ بہتر جانتا ہے کہ مقصود مخفف اظہار حق اور خیرخواہی ہے۔ ہمارے سامنے مسلمانوں کی سائٹ تیرہ سو برس کی تاریخ کے صفحات کھلے ہوئے ہیں تباہ کیہ اور اس کو بتلاتے ہیں کہ فرقانی آیات کو نافہم لوگوں نے کس طرح اپنے مقاصد اور مطالب کے سلسلہ میں استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے خود کو قرآن سے اپنی فکر اور اپنے تصورات کے قریب کرنا چاہا۔

پوسے و ثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس سلسلہ میں جن لوگوں سے ارادی یا غیر ارادی طور پر غلطیاں ہوئی ہیں اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے فہم قرآن کے اصول و شرائط کی ترتیب نہیں کی اور تجھے یہ ہوا کہ ان میں سے ہر شخص اپنی رائے کو قرآن سے مدل بھجنے لگا اور اس پر مطمئن ہو گیا جس کا دل چاہے رازی کی جج القرآن نیز کلامی طریقہ کو پڑھ کر ہماری رائے کی تصدیق کر سکتا ہے۔

اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اہل ذوق کو صحیح راستہ کی نشان دہی کر دی جائے جس کے اختیار کرنے کے بعد انشار اللہ کلام الہی کے اسرار کے گھلنے کی توقع اور مقصود حقیقی کے حصول کی امید ہے۔

وَاللَّهُ وَلِيُّ التَّوْفِيقُ

محمد اولیس ندوی نگاری

دارالعلوم ندوۃ العلماء

کھنڈ

یکم ستمبر ۱۹۷۵ء

(۱)

قرآن مجید کے سچے طالب علم اور اس سے حقیقی استفادہ کرنے والے کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ اس کا دل قرآن مجید کی عظمت سے محور ہو اور یہ نویقین اس کی رگ و پے میں سراستہ کئے ہوئے ہو کہ:-

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی صفات ازلیہ میں سے ایں صفت است از صفات ازلیہ بانیہ کہ آنرابعہ امکان پیچ گونہ مناسبتے نہ ہو
امکان سے کوئی مناسبت نہیں۔ اللہ تعالیٰ درکوت زبان عربی ہماں و صفت
نے مخفف اپنی مہربانی سے اپنے اس کمال ذاتی اور صفت اذلی کو عربی زبان کا جامہ پہننا کر
نہیں راوی اسطہ فیما بینہ و بین العباد
نہیں فرمایا اور اس کو اپنے اور بندوں کے درمیان واسطہ بنایا۔
گردابینہ۔

(صراط مستقیم:- از مولانا اسمبلی شہید رحمۃ اللہ علیہ)

عقیدہ کے اعتبار سے ہر مسلمان قرآن مجید کو اللہ کا کلام تسلیم کرنا ہی ہے لیکن اس سے نفع اٹھانے کیلئے اس عقیدہ کا استحضار ضروری ہے۔

قرآن مجید میں بار بار فرمایا گیا ہے کہ قرآن کو ہمنے آتا رہے ا! قرآن اللہ کی طرف

۹

سے ہے۔ خوب ذہن نشین رہنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کا اس طرح قرآن مجید کو اپنی طرف مسوب فرما اور اس نسبت کو بار بار ظاہر فرمائی محض سلسلہ سند کے بیان کیلئے نہیں ہے بلکہ اس سے قرآن مجید کی عظمت اور بلندی کا اٹھا رکھی مقصود ہے اس لئے کہ متکلم کی عظمت اور اس کا مرتبہ کلام کی عظمت کا باعث ہوا کرتا ہے۔

ہزار جان گرامی فدا ب ایں نسبت

کمیری ذات سے اپنا پتہ دیا ترنے

اس نسبت خداوندی کی وجہ سے قرآن کی عظمت اور اس کے مضامین پر یقین کا پیدا ہونا ہی دراصل شرح ایمان کی روشنی کا باعث ہے۔

ظلوم و جہول انسان قرآن مجید کی اس نسبت کی عظمت اور جلالت کو نہ محسوس کرے تو یہ اس کی کم مانگی اور کوئہ تاہ نظری ہے ورنہ حال تو یہ ہے کہ:-

لَوْ أُنْزِلْنَا هَذَا الْقُرْآنَ عَلَى إِلَهِمْ تَأْتِيَتِيهِ يَقْرَأُونَ إِلَيْهِمْ بِهِمْ بَلْ لَرَأَيْتَهُمْ خَâ شِعّâ
یتاکہ وہ دب جاتا، بھٹ جاتا اللہ کے ڈر سے۔
مَتَصَدِّدٌ عَâ مِنْ خَشِيَّةِ اللَّهِ ۝ (سورہ حشر ۱۲)

یعنی صاحب قرآن کی عظمت کا یہ عالم ہے کہ اگر یہ قرآن کسی پہاڑ پر تارا جاتا تو متکلم کی ہیبت و جلال کے سامنے وہ دب جاتا اور خوف کی وجہ سے بھٹ کر پارہ پارہ ہو جاتا جو جنت کے ارجمند اور طائع کے فیروز مند قرآن کی اس نسبت کی یقین دادع ان سے ہے وہ منہیں ان کا معاملہ یہ ہے کہ:-

وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيَّ
الرَّسُولُ تَرَى أَعْيُنَهُمْ تَفِيقُ
او جب سنتے ہیں اس کی جواہر ارسول پر تو تو
دیکھ اون کی آنکھوں کو کہ ابلقی ہیں آنسوؤں سے

مِنَ الدَّمْعِ مِنَاعَرَفُوا مِنَ الْجُحْتِ۔ (سورہ مائدہ ۱۱) اس لئے کہ انہوں نے پہچان لیا جت بات کو۔
یہ سعادتمند نغوس جب اللہ کا کلام سنتے ہیں تو ان کے دل کا نپ اٹھتے ہیں،
اور بدن کے روئے کھڑے ہو جاتے ہیں، خوف اور رعب کی کیفیت طاری ہو کر ان کے
قلب و قالب اور ظاہر و باطن کو اللہ کی یاد کے سامنے جھکا دیتی ہے ارشاد فرمایا:-

<p>اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثَ كِتَابًا مَشَّشِ بِهَا مَثَانِي تَقْشِيرًا مِنْهُ جَلُوْدُ الدِّينِ يَخْشُونَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيهِنْ جَلُوْدُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ (سُورہ زمر ۳)</p>	<p>اللہ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثَ كِتَابًا مَشَّسِ بِهَا مَثَانِي تَقْشِيرًا مِنْهُ جَلُوْدُ الدِّینِ يَخْشُونَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيهِنْ جَلُوْدُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ (سُورہ زمر ۳)</p>
<p>ان پاک نفوس کا یہ حال ہے کہ اللہ کا کلام ان کے ایمان کو مزید ترقی فرماتا ہے۔ ایمان والے وہی ہیں کہ جب نام اللہ کا آیا تو ڈھائیں ان کے دل او جب پڑھائیے ان پر اس کا کلام تو زیادہ ہو جاتی ہے ان کا ایمان۔</p>	<p>إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجْلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ بِيَاتِهِ زَادَ تَهْمُّهُ إِيمَانًا (سُورہ الفال ۱)</p>

اور اسی نسمہ شفا بین اون کو اپنے قلبی اور روحانی امراض کے علاج کا سامان
مل جاتا ہے:-
اوہم تارتے ہیں قرآن میں سے جس سے
رُوگ دور ہوں اور رحمت ایمان والوں
کے واسطے۔

<p>وَنَزَّلْنَا مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شَفَا وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ۔ (تی اسرائیل ۹)</p>

حاصل یہ ہے کہ قرآن مجید سے نفع اٹھانے کیلئے ضروری یہ ہے کہ قرآن کی عللت اور اس کی صداقت کا یقین لہو کے ماتندر گوں میں دوڑتا ہو اور تلاوت و تذہب کی کیفیت ہو کہ قرآن مجید ہی اس کامونس وہدم بن گیا ہو، امام شاطبی (المتوفی ۷۹۷ھ) نے موافقۃ میں سچھ فرمایا۔

”جو شخص دین کو جاننا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن ہی کو اپنا مونس وہدم بنائے۔ شب و روز قرآن ہی سے تعلق ہو، یہ ربط و تعلق علمی اور عملی دونوں طریقوں سے ہونا چاہئے۔ ایک ہی پراکتنا نہ کرے جو شخص یہ کرے گا امید ہے کہ وہ مقصود کو پالے گا۔ (الموافقات ج ۳ ص ۳۶۷)

(۲)

جن طرح اللہ تعالیٰ اپنی صفت کلام کو زبان عربی کا لباس پہنا کر اور اس کو قرآن مجید کا نام دے کر اپنے اور بندوں کے درمیان واسطہ بنایا اسی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو قرآن کی تشریع و تفضیل اور اسکی علمی تفسیر کیلئے مطلع انوار بنایا اس لئے قرآن مجید سے نفع اٹھانے کیلئے ضروری ہے کہ پورے شرح صدر کے ساتھ اس وجود گرامی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ اعتماد، اتباع اور انقیاد کا تعلق ہو اس واسطہ کے بغیر قرآن مجید سے استفادہ کی امید کرنا ایک فعل عبث ہے۔

خود قرآن مجید نے اپنا اور سعیہ کا جو رشتہ اور تعلق ظاہر کیا ہے وہ اس بات کے لئے واضح دلیل ہے کہ قرآن مجید سے استفادہ کرنے والوں کے لئے دامن نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم سے وابستگی ضروری ہے۔ ارشاد فرمایا:-

يَتَلَوُ عَلَيْهِمْ أَيْتِهِ وَيُزَكِّيْهِمْ وہ (رسول) ان کو اللہ کی آیتیں سنانا اور

سنانا اور ان کو کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔

وَعِلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔

(سورة جمعر - ۱)

علوم ہو اکہ اللہ کی کتاب کی تعلیم سعیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نبوت کے فراہض میں داخل تھی۔ دوسرے موقع پر ارشاد ہوا:-

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْذِكْرَ لِتُبَيِّنَ
آدَمْ نَسْأَلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ
لِلنَّاسِ مَا نُرِّزَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ
يَتَفَكَّرُونَ۔ (سورة نحل ۶)

مطلوب یہ ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم اور اس کے شرح و بیان کی ذمہ داری خدا کی طرف سے سعیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سپرد کی گئی ہے، اب اس نور نبوت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے الگ ہو کر قرآن مجید پر غور کرنا اور اس کے مفاسین سے نفع اٹھانے کی توجیخ کھانا بحرظلمات میں قدم رکھنا ہے۔

اسی لئے جب مطرف بن شیخزیر سے ایک شخص نے کہا کہ آپ ہمارے سامنے قرآن کے سوا یہ بیان کیجئے تو انہوں نے فرمایا:-

وَاللَّهِ مَا نَرِيدُ بِالْقُرْآنِ بَدْلًا وَلَكَ
اللَّهُ كَيْفَ يُقْرَأُ الْقُرْآنُ

نہیں جاہتے لیکن ہم کو قرآن کے ساتھ اس نویں من هو اعلم بالقرآن۔

(الموافقات ج ۳ - ص ۳۷)

کی تلاش بھی ضروری ہے جو قرآن کا سب سے زیادہ

سچھ والا تھا۔ (یعنی آخر فترت صلی اللہ علیہ وسلم)

وَلَكَ

امام شاطبی فرماتے ہیں کہ

سنت کتاب اللہ کیلئے بخنزلہ شرح و تفسیر کے ہے۔

الموافقات ج ۲ ص ۱

یہ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم وہ انعام خداوندی ہے جس کو قرآن مجید میں الشتعانی
کے مخصوص احسانات کے ضمن میں شمار فرمایا گیا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يَعِظُهُمْ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يَعِظُهُمْ
بَعْثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ أَتَتْهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْ أَنفُسِهِمْ وَيَتَلَوَّهُمْ
عَلَيْهِمْ أَيَّاتِهِ وَيُرِيكُّهُمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (آل عمران ۱۷) اور ان حکمت
ابوحیان اندسی اپنی تفسیر الحجر المحيط (ج ۱ ص ۳۹۳) میں حکمت کے معنی
بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

قال مجاهد الحکمة فهم القرآن
مجاہد کا قول ہے حکمت یعنی قرآن کا فہم۔

امام طبری فرماتے ہیں:-

”ہم کے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ حکمت ان احکام آہی کے علم کا نام ہے جو حرف
رسول کے بیان (تشريع) سے معلوم ہوتے ہیں“

امام شافعی کتاب الرسائل میں لکھتے ہیں:-

”یہ نے قرآن کے ان اہل علم سے جن کو پسند کرتا ہوں یہ سنا کہ حکمت آنحضرت صلی
اللہ علیہ وسلم کی سنت کا نام ہے“

قرآن مجید سے نفع اٹھانے میں اس حکمت یعنی سنت کو اس قدر دخل ہے کہ امام
شافعی نے اپنا فیصلہ سنادیا:-

سنت جو کہ قرآن کی مفسرا و شارح ہے اس
ولا یقدِر عَلَیْهِ الْأَمْنُ زَاوِلَ مَا
یعینَهُ عَلَى ذَلِكَ مِنَ الْسَّنَةِ الْمَبَيْنَ
سے شُفَرَ رَكْنَهُ وَالْأَهْيَ فَتَرَ آنِ مجید کو مجھ
لِكْتَابِ (الموافقات ج ۳)
سکتا ہے۔
اور قاضی ابن العربي مالکی نے تو یہاں تک فرمایا کہ:-

”قرآن مجید کا ہر وہ لفظ جس سے کوئی حکم نکھلا ہو وہ لفظ محل ہو تو اس کی تشریع
حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر موقوف ہو گی، اس کی تفصیل کو شریعت میں
تلکش کیا جلتے وہ ضرور طے گی۔ اگر ہم فرض کر لیں کہ اسکی تشریع نہیں ملتی ہے تو اس حکم کی
ذمہ داری باقی نہیں رہے گی۔“ (احکام القرآن ج ۱ ص ۵)

اممہ دین کی ان تصریحات سے صاف واضح ہے کہ فہم قرآن کیلئے سنت نبوی (صلی
اللہ علیہ وسلم) سے ربط و تعلق کس قدر ضروری ہے۔

(۳)

قرآن مجید سے کمل اصلاح استفادہ کیلئے ضروری ہے کہ ہم کو اس سے نفع حاصل
کرنے کی فکر ہو اور اس کے برکات سے مستفید ہونے کی طلب بھی دل میں موجود ہو۔ اسی
لئے ارشاد فرمایا:-

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ (بقرہ ۱) راہ بتلاتی ہے ڈرنے والوں کو۔

جناب مولانا محمد قاسم صاحب ناظرتویؒ کا ارشاد ہے کہ یہاں تقویٰ سے مراد اس
کے اصطلاحی معنی نہیں ہیں بلکہ لغوی معنی مقصود ہیں یعنی خوف و گھنک، اس اعتبار سے
گھنک کا مطلب یہ ہو گا کہ
جن لوگوں کے قلب میں گھنک ہے اور فکر و قصد ہے اپنی اصلاح کی فرمان مذہبہ ت

استدلال کیا۔

سَاصِرِتْ عَنْ أَيَّاتِ الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ میں بھیر دوں گا اپنی آیتوں سے ان کو جو تکبر کرتے
فِ الْأَرْضِ بَغَيْرِ الْحَقِّ۔ (یعنی زمین میں ناحق۔ (اعراف)

پھر اس آیت کی تفسیر میں سفیان بن عیینہ سے یہ نقل فرمایا کہ:-

”ایے لوگوں سے فہم قرآن چھین لیا جاتا ہے۔“ (التفاقن۔ ج ۲ ص ۱۸۱۔ مصر)

آیت ذیل بھی اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَذِكْرٍ لِّمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ اس میں سچنے کی جگہ ہے اس کو جس کے کان دری
أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ۔ (ق۔ ۳) ہے یا لکھنے کا ان دل کا کر۔
حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

”کسی چیز کی تاثیر کیلئے ضروری ہے کہ (۱) کوئی موثر ہو (۲) جس پر اثر دانا
مقصود ہو۔ وہ ہو (۳) اثر ہونے کے شرائط موجود ہوں (۴) جو چیزیں اثر
کو زائل کرنے والی ہوں وہ نہ ہوں۔ اس آیت میں (قرآن مجید) سے استفادہ
کے سلسلہ میں، ان سب چیزوں کا ذکر موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قول ایش
فِي ذَلِكَ لَذِكْرٍ“ میں موثر کی طرف اشارہ ہے۔ ”لَمَنْ كَانَ
قَلْبٌ“ سے قلب بیدار مراد ہے (اس لئے نصیحت قبول کرنے کی جگہ دل ہی
ہے)۔

قرآن نے ارشاد فرمایا۔

یہ تو خالص نصیحت ہے اور قرآن ہے
صاف تاکہ مدرسنا نے اس کو جس میں

کرتا ہے۔“

مولانا نازنتوئی نے اس موقع پر بہت ہی لطیف استدلال فرمایا ہے ان کا ارشاد ہے:-

”سورہ واللیل میں ارشاد ہے، فَأَمَّا مَنْ أَعْطَى وَالْقَى وَصَدَقَ بِالْحَسْنَى۔

اس کے بعد ارشاد ہے۔ فَأَمَّا مَنْ بَخْلَ وَأَشْتَغَبَ وَكَذَّبَ بِالْحَسْنَى۔ یہاں
صنعت تقابل کا استعمال کیا گیا ہے چنانچہ پہلی آیت میں اعطاہ کا ذکر ہے تو دوسرا آیت میں
اس کے مقابل میں ”بخل“ کا استعمال ہے۔ اسی طرح پہلی آیت میں ”کذب“ ہے تو دوسرا
مرتبہ ”صدق“ اسی طرح ”ستفی“ اور ”اتقی“ کا تقابل ہے۔ اس تقابل کی وجہ سے
تقویٰ کے وہ معنی ہوں گے جو ستفیٰ کے مقابل ہوں۔ استغفار کے معنی بے فکری کے
ہیں تو تقویٰ کے معنی ہوں گے، فکرا و کھٹک، (طفوظات حضرت تھانویؒ، ص ۱۷)

بے شہر واقعی یہ ہے کہ قرآن مجید سے استفادہ کرنے کیلئے طلب صادق کی ضرورت
ہے، اس کے بغیر را کھلنی نہیں ہے۔ طلب صادق کا مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں قرآن
مجید سے استفادہ کرنے میں معاون ہوں ان کو اختیار کیا جائے اور جو چیزیں مضر ہوں ان کے
احتراز کیا جائے۔

حافظ جلال الدین سیوطی نے اتفاق میں ابوالمعانی کی بُرهان کے حوالہ سے اس
موقع کیلئے بڑے کام کی بات لکھی ہے۔ فرماتے ہیں۔

”اگر کسی کے دل میں بدعت، تکبیر، خواہش نفسی اور دنیا کی محبت موجود ہے یا وہ
گناہ کا عادی ہے، یا ایمان کر دے ہے، تحقیق کا مادہ کم ہے غیر مستند لوگوں کی تفسیر قبول کر لیتا
ہے تو نہ وہ قرآن بمحض سکتا ہے اور نہ اس پر اُس کے اسرار کھل سکتے ہیں۔“

اس کے بعد صاحب بُرهان کے اس قول پر حافظ سیوطی نے حسب ذیل آیت سے

حَتَّىٰ - (پیسین ۵) جان ہو۔

الْقَوْنِي الشَّمْخَ كا مطلب یہ ہے کہ جو کہا جائے اس کو دل لگا کر سُنے کسی بات سے متاثر ہونے کی یہی شرط ہے۔ وَهُوَ شَهِيدٌ كا مطلب یہ ہے کہ دل حاضر ہو غفلت اور بے فکری اثر ہیں ہونے دیتی ہے۔“

پس جب موثر یعنی قرآن مجید اور عمل قابل یعنی قلب بیدار اور اثر ہونے کی شرط یعنی توجہ کامل موجود ہو اور اثر کو زائل کرنے والی چیز یعنی غفلت اور بے فکری نہ ہو تو (افتخار اللہ) مقصود یعنی قرآن سے نفع حاصل ہو جائے گا۔ (تفسیر القیم ص ۲۳۴)

(۳)

قرآن مجید کے طالب علم کا ذہن۔ اس معاملہ میں بھی صاف ہونا چاہئے کہ ہم کو قرآن مجید سے کتنے امور میں رہنمائی کی ضرورت ہے؟ قرآن مجید کا موضوع اور اس کا عنوان کیا ہے؟ اس عقدہ کا حل نہ ہونے کی وجہ سے اس راہ کے کتنے مسافر منزل مقصود سے خودم ہے۔ وہ سراب کو اپنی تشنہ بھی کاسلام کیجھے اور نتیجہ میں چیرافی و پریشانی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔

اس حقیقت کو خوب اپنی طرح بمحض لینا چاہئے کہ قرآن مجید کی اصل دعوت انسان کو سعادت ابدی کی طرف بُلائی ہے۔ وہ انسان کے ظاہر و باطن کی ایسی تعمیر کرنا چاہتا ہے کہ حیات اخروی میں اس کو کوئی زحمت نہ پیش آئے، وہ انسان کا ایسا تزکیہ کرنا چاہتا ہے کہ وہ مارگاہ الہی میں حضوری کے لائق بن سکے۔

بے شبه قرآن مجید نے دنیاوی زندگی کے تمام اصولی و قواعد مرتب فرمائے ہیں، انفرادی اور اجتماعی زندگی کے قوانین، عقائد، عبادات، اخلاق، معاملات، حقوق اور آداب

اس نے سب سے بہت فرمائی ہے، مگر ان تمام امور میں بنیادی نقطہ نظر اخروی سعادت ہے یہی وجہ ہے کہ ان مباحثت کا جن آیات میں ذکر آتا ہے ان کے اول یا آخریں یا درمیان میں ترغیب یا تحریک کی آئیں، جنت و دوزخ اور عذاب کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنی میں سے موقع کا اعتبار کسی مناسب اسم و صفت کا تذکرہ فرور ہوتا ہے تاکہ پڑھنے والا یہ بات سمجھتا رہے کہ ان قوانین کی پیروی کے نتیجہ میں ابدی راحت اور نافرمانی کی صورت میں اخروی ذلت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ امام شاطبی نے المواقفات (ج۔ ۳) میں بڑے کام کی بات کہی کہ

”قرآن مجید کے اصل علوم تین ہی ہیں (۱) ذات حق کی معرفت (۲) حق تعالیٰ کی رضاکی صورتیں (۳) انسان کا انجام۔ پہلے علم یعنی ذات حق کی معرفت میں اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات اور افعال کا علم داخل ہے اور اسی سلسلہ میں بہوت سے بھی بحث ہے اسلئے کہ عبد اور معبود کے درمیان یہی واسطہ ہے، دوسرا علم میں عبادات اور معاملات وغیرہ داخل ہیں۔ تیسرا علم میں ووت اور اس کے حوال، قیامت اور اس کے کشتملات اور جنت و دوزخ کے حوال داخل ہیں، اسی قسم میں ترغیب اور تحریک کی آیات اور وہ آئیں جن میں نیکوکاروں کی بخشات اور بدکاروں کے برعے انجام کے واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ بھی شامل ہیں۔“

مقصود یہ ہے کہ قرآن مجید کا اصل موضوع، انسان کی وہ رہنمائی ہے جس سے دنیا میں وہ ایسی زندگی گزارے جو آخرت میں اس کے لئے لفظ بخش ہو اور رفاقتے الہی اس کے نسب میں آئے۔

قرآن مجید نے اپنے کو دنیا میں اسی پیغام کے ساتھ پیش کیا ہے اور اپنی دعوت کے اسی عنوان کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا ہے۔ اسی سلسلہ کی چند آیات ملاحظہ ہوں۔

ذِلْكَ الْكِتَابُ لَا رَبَّ يَرِبُّ فِيهِ هُدًى
لِلْمُتَّقِينَ۔ (بقرہ)

إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي إِلَيْكُمْ
بِهِ أَقْوَمُ۔ (اسراء)

وَنَزَّلْنَا مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شَفَاءٌ
وَرَحْمَةٌ لِلْمُوْمِنِينَ۔

قُلْ هُوَ لِلَّذِينَ آمَنُوا هُدًى وَ
شَفَاءٌ (فصلت)

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قُدْ جَاءَكُمْ
مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشَفَاءٌ
لِمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ
لِلْمُوْمِنِينَ۔ (بلوس)

حاصل یہ ہے کہ قرآن کے احکام، تعلیمات، ارشادات اور اس کی ہدایات ہی اس کے وہ اوصاف خصوصی ہیں جو اس کی دعوت کا اصل موضوع ہیں، اسی لئے اہل علم کی ایک جماعت مثل ایشیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اسی کو قرآن کا اصلی اعجاز قرار دیا ہے۔ پس قرآن مجید کی آیات پر غور کرنا چاہیے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے الفوز الکبیر میں صراحت کے ساتھ فرمایا ہے!

معنی آنست کہ قصد اصلی از نزول قرآن مجید کے نزول کا اصل مقصد انسانوں کی تہذیب و تربیت اور ان کے عقائد باطلہ اور اعمال فاسدہ کی اصلاح ہے۔

شah صاحبؒ نے اسی مفہوم کو تفہیمات میں اس طرح ادا کیا۔

”اللّٰهُ تَعَالٰی نے مجھ کو تفسیر کا علم مختصر الفاظ میں عنایت فرمادیا جس کی حقیقت یہ ہے کہ ایمان حقیقی ہر انسان کے قلب کے اندر دلیلت ہے لیکن مادی زندگی کی سرمنیوں نے انسان پر قبضہ پالیا پس اللّٰهُ تَعَالٰی نے قرآن مجید نازل فرمایا تاکہ اس کے ذریعہ سے ان کی طبیعتوں کو مغلوب فرمائے۔“

(ج-۲۔ ص ۱۳۲ و ۱۳۳)

مطلوب یہ ہے کہ قرآن مجید کا اصل موضوع یہی ہے کہ عبد او جمود کے رشتے کو صحیح اصولوں پر استوار کیا جائے اور دنیاوی زندگی کو اُخڑوی زندگی کی بنیاد بنا جائے۔

اب کس قدر تم ہے کہ لوگ قرآن مجید میں قدیم و جدید فلسفہ کے مباحثہ پیش کے مسائل، سائنس کے کثموں اور تاریخ و جغرافیہ کے نکات کی تلاش و جستجو کرتے ہیں اور اسی اعتبار سے قرآن کی صداقت اور اسی معیار سے اس کی عظمت کو جانچنا چاہتے ہیں! ہم کو اس سلسلہ کے ضمنی فوائد سے انکا زہین لیکن ظاہر ہے کہ یہ چیزیں قرآن کا موضوع نہیں ہیں اور اس کا منقام تو اس کے کہیں ارفع و اعلیٰ ہے۔ بے شکر قرآن مجید نے کائنات اور اس کے حوالوں سے تعریض کیا ہے مگر اسکی نوعیت کیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں:-

”قرآن مجید علوم طبیعہ کا بھی ذکر فرماتا ہے لیکن فلسفی اور صاحب قرآن

کے نقطہ میں فرق ہے مثلاً ایک طبیب جانوروں کو دیکھتا ہے تو وہ ان کے خاص پریغور کرتا ہے اور صاحب دولت جب جانوروں کو دیکھتا ہے تو وہ سوچتا ہے کہاں میں سے سواری کے لائق کون ہے اور بار بارداری کے قابل کون ہے؟ اسی طرح صاحب قرآن بھی کائنات سے تعریض کرتا ہے مگر اس کا مقصود اللہ کی قدرت اور اس کے علم و حکمت کا اظہار ہوتا ہے اس کے سوا اور کچھ مقصود نہیں ہوتا ہے۔ (سطعات ص ۱۲-۱۳)

یہ تو دنیاوی علوم کا مسئلہ ہے۔ شاہ صاحب کو تو اس باب میں ان لوگوں سے بھی شکوہ ہے جو غالص دینی علوم میں اس قدر غلوکرتے ہیں کہ مقصود ان سے گم ہو جاتا ہے، قصص قرآن کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

”قرآن مجید نے جن قصص کو بیان فرمایا ہے، ان کے هر فضولی حصوں کا ذکر کیا ہے ان کے تمام اجزا کے ذکر سے احتیاز کیا ہے۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ اگر پورا واقعہ بیان کیا جائے تو وہ لوگ ان واقعات میں پڑھاتے ہیں اور عبرت پذیری جو مقصود اصلی ہے اس سے غافل ہو جاتے ہیں اس لئے قرآن نے ان ضروری حصوں کو لیا۔ باقی کوچھ ٹوڑ دیا۔ ایک عارف نے کہا ہے کہ جب سے لوگ تجوید و قواعد میں (غلوکے ساتھ) لگئے تلاوت قرآن میں خشوع باقی نہ رہا اور جب سے اہل تفسیر نے تفسیر میں دور از کار بخنوں کو چھپیا فن ختم ہو گیا۔“ (الفوز الکبیر)

قرآن مجید کے طالب علم کو اس سلسلہ میں بہت مختاط رہنا چاہئے اور اسکی نظر قرآن کے اصل موضوع پر رہنا چاہئے تاکہ گوہ مقصود ہاتھ آجائے۔

(۱۵)

قرآن مجید کے الفاظ کی تشریح کیلئے سبے بہتر طریقہ یہ ہے کہ سبے پہلے قرآن اس کے بعد سنت اور پھر اقوال صحابہ و تابعین کی طرف رجوع کیا جائے۔

قرآن عربی زبان میں ہے اس لئے بے شے قرآن کے الفاظ کی تشریح کے سلسلہ میں لفت سبے چارہ نہیں اس لسانی اہمیت کو تسلیم کرنے ہوئے بھی یہ امر مقابل لحاظ ہے کہ قرآن کی کچھ خود اپنی اصطلاحات میں اور ان کو کتاب و مستشرقی سے حل کیا جاسکتا ہے، مثلاً سورہ فاتحہ میں نظم ”صراط مستقیم“ ہے، لغت میں جس کے معنی ”سیدھے راستے“ کے ہیں۔ مگر قرآن نے ”صراط مستقیم“ کے لفظ سے کوئی سیدھا راستہ مراد نہیں ہے؛ اس کی تشریح بعد کو خود ہی فرمادی۔ یعنی

صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ	ان کا راستہ جن پر آپ نے انعام کیا ہے۔
أَنَّكُمْ كُنْتُمْ بِرَبِّكُمْ هُنَّ مُوقِّرُ فِرَادٍ إِنَّمَا	انعام کن لوگوں پر ہوا ہے؛ اس کی تشریح بھی دوسرے موقع پر فرمادی گئی۔
وَعَنِ تِبْيَعِ اللَّهِ وَالرَّسُولِ فَإِنَّكُمْ مَنْ	جو کوئی حکم مانے اللہ کا اور اس کے رسول کا سوہہ
مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنْ	ان کے ساتھ ہے جن پر اللہ نے انعام کیا
النَّبِيِّينَ وَالصَّدِيقِينَ وَالشَّهِيدِينَ وَالزَّاهِدِينَ	کروہ نبی اور صدیقین اور شہید اور زنیک
وَالصَّابِرِينَ	مجنت ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ”صراط مستقیم“ سے مراد ان بیمار صدقین، شہید اور صالحین کا راستہ ہے۔

اسی طرح سورہ آل عمران کے آخر میں فرمایا کہ زمین و آسمان کی پیدائش اور شب و روز کے اُٹ پھیر میں پختہ عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ قرآن مجید نے اس

فرمایا ہے۔ ۶۰ اور وہ لوگ جو قرآن کے اولین مخاطب تھے کیا سمجھتے تھے؟ (صفحہ ۶۷)

علامہ قرطی (۶۲۷ھ) نے اپنی تفسیر "الجامع لاحکام القرآن" میں فرمایا۔

بے شکن ساع اونچل کی مد لئے بغیر مخفی عہبت کی بنار پر قرآن کی تفہیم

کرے گا اس سے بہت غلطیاں ہوں گی اور وہ تفسیر بالکل کام تک ہو گا۔“

قرآن مجید کے الفاظ کی تفسیر و توضیح و تشریع کیلئے لغت عرب کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کے عرف ایسکی اصطلاحات اور جناب محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تشریحات کا اسلام ضروری ہے۔ ورنہ نتناج گبے مدد خطرناک ہیں۔

اس موقع پر مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حب ذیل ہدایت زیادہ لائق
توجہ ہے۔

”مفرادات میں قرآن مجید وہ کلمہ اختیار فرماتا ہے جس سے اوفی یا الحقيقة و اوفی بالمقام تقلید نہیں لاسکتے، مثلاً جاہلیت کے اعتقادوں میں موت پر توفی کا اطلاق درست نہ تھا۔ کیونکہ ان کے اعتقادوں میں نہ بقاۓ جس دنی اور نہ بقاۓ روح، توفی، وصول کرنے کو کہتے ہیں ان کے عقیدہ میں موت توفی نہیں ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید نے توفی کا لفظ اطلاق کیا اور بتلیا کہ موت سے وصول یابی ہوتی ہے نہ فنا نجض، اس حقیقت کو ایک کلمہ سے کشف کر دیا اور یہیں اس لفظ کا اطلاق لینے اصلی معنی سمع الروح کے وصول کرنے پر کیا۔

شہزاد احمد علیہ کے رشتاد کا حاصل یہ ہے کہ قرآن مجید جس موضع پر جو لفظ

موضع پر سچتہ عقل والوں کے لئے اولوالا باب کا لفظ استعمال کیا ہے قرآن کے نزدیک اولوالا باب کون لوگ مراد ہیں؟ اس کی تشریع میں ارشاد فرمایا گہ اولوالا باب دہ لوگ ہیں جو اٹھتے بلیختے ہر حال میں خدا کریا دکتے ہیں۔

قرآن مجید میں عبادات کے سلسلہ میں، صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، حج کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ لغت میں صلوٰۃ کے معنی دعا کے ہیں۔ زکوٰۃ کے معنی بڑھنے کے، صوم کے معنی قصد کرنے کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان الفاظ کے معنی یہاں مقصود نہیں ہیں بلکہ ان میں سے ہر لفظ کا خاص مفہوم مراد ہے اور اس مفہوم کی تعین سنت کرتی ہے اگر اس تعین کو نہ ماناجاً اور صرف لغت کو سامنے رکھا جائے تو عبادات کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہ سکتی ہے۔ اسی لئے حافظ ابر قمیؒ نے ذمہا۔

”قرآن مجید کا ایک خاص عرف ہوتا ہے اور اُس کے کچھ متعین معنی ہوتے ہیں اور اس عرف سے ہٹ کر قرآن کی تفسیر چاڑنہیں۔

(التفسير القيمي ص ٣٤٩)

اس زمانے میں قرآن مجید کے سمجھنے کے جو دردناک اور تکلیف دہ مناظر مانے آتے ہیں ان میں سے ایک روح فرمان نظری ہے جیسے ہوتا ہے کہ عربی زبان کی چند روایتوں پر کوئی لوگ لپٹنے کو فہم قرآن اور اس سے استنباط و استناد کا جائز حق دار جانے لگتے ہیں۔ یہ سخت جرأت کی بات اور انتہائی غیر ذمہ دار از اقدام ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ اپنے رسالہ "أصول تفسیر" میں تفسیری غلطیوں کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

"دوسرے وہ لوگ ہیں جنہوں نے قرآن کی تفہیم حضر لغت عرب سے کی ہے اور یہ لحاظ نہیں کیا کہ مشکل مکالم قرآن کی کیا مراد ہے اور اس نے جس پر قرآن نازل ہوا، کیا مطلب بیان

استعمال فرماتا ہے وہ موقع اور ادائے مطلب کے لحاظ سے بحیدا ہم ہوتا ہے، با اقتا ایک لفظ پرے ایک مسئلہ کا حامل ہوتا ہے اس لئے الفاظ قرآن کے معنی کی تعین و تشریح میں بے حد اختیاط کی ضرورت ہے۔

(۴)

قرآن مجید کی آیات کے مفہوم کی تعین میں بھی یہ اصول پیش نظر ہنا چاہیے کہ بہترین طریق کاری ہی ہے کہ آیات قرآنی کی تشریع قرآن اور اس کے بعدست اور احوال صاحبہ تابعین سے کی جائے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے فرمایا۔

”تفصیر کا بہترین طریق یہ ہے کہ قرآن کی تغیری خود قرآن سے کی جائے۔ قرآن میں جو مضمون ایک جگہ محل ہے، دوسری جگہ مفصل ملے گا۔ اور جہاں اخشار سے کام لیا گیلے ہے دوسری جگہ اس کی تفصیل ملے گی اور اگر اس میں کامیاب نہ ہو سکو تو سنت کی طرف برجع کرو۔ جو قرآن کی شرح اور تفسیر کرتی ہے بلکہ امام ابو عبد اللہ محمد بن ادريس الشافعی نے توہیناں تک فرمادیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جو حکم دیا ہے وہ قرآن ہی سے اخذ ہے۔

(اصول تفسیر صفحہ ۹۲)

قرآن مجید کی آیات متشابہ یعنی ملی جلی ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کی تصدیق و تائید کرتی ہیں۔ ارشاد فرمایا۔

اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحِدْيَةِ كِتَابًا
اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحِدْيَةِ كِتَابًا
مُّتَشَابِهًا مَثَانِي -
دُعْرَائِي ہوتی -

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس مفہوم کو ان الفاظ میں ادا فرمایا ہے۔

آیات قرآن متشابہ اند بعض آن صدق است و آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ایک آیت دوسری آیات کی صدق ہے اور صلی مفسر قرآن عظیم کے آنحضرت صلی مسین قرآن عظیم است، (ازالۃ الخفا مقصد اول فصل سوم) اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اسلئے ہر آیت کا وہ مطلب ہر ادینا چاہیے جس کی تائید دوسری آیت و سنت سے ہوتی ہے۔ اگر اس اصول کی رعایت نہ کی جائے گی، تو قدم قدم پر لغزش کا ندیشنا ہے، مثلاً سورہ بقرہ میں یہود کے باب میں فرمایا گیا ہے کہ یہ دنیا میں ہمیشہ ذلیل و رسار ہیں گے۔ ارشاد ہوا۔ وَخُرُبَتْ عَلَيْهِمُ الدِّلَّةُ وَالْمُسْكَنَةُ وَ اور ڈالی گئی ان پر ذات اور رسوائی اور پھرے اللہ باَوْ لِغَضِيبٍ مِّنَ اللَّهِ۔ (بقرہ) کاغذب لے کر۔

لیکن ادھر جب سے اسرائیل کی حکومت قائم ہوئی اور یہود کو ایک وطن ملا اس وقت سے برابرا استفسارات ہوتے رہتے ہیں کہ قرآن نے تو یہود کے متعلق ذات و رسوائی کی پیشگوئی فرمادی تھی اب یہود کیسے اقتدار کے مالک بن گئے؟ حالانکہ سورہ آل عمران میں اسکی تفضیل موجود ہے وہاں فرمایا۔

اَرْدِی گئی اُن پر ذات جہاں پائے جائیں سوا پَعْبُلٌ مِّنَ اللَّهِ وَجَلٌ مِّنَ النَّاسِ (آل عمران ۱۲) دستاویز اللہ کے اور دستاویز لوگوں کے۔ اس آیت میں واضح فرمادیا گیا کہ یہود کو ذات و رسوائی سے بچنے کی دوہی صورتیں ہیں وہ یا اسلام قبول کر لیں یا دنیا میں کسی دوسرے کی سر پستی قبول کریں۔ مطلب یہ ہے کہ دوسروں کے سہا ہے کے بغیر وہ قومی عزت کے مالک نہیں بن سکتے۔ اب بنی اسرائیل کی حکومت کا قیام لَمَّا لَّا يَحْبَلُ لِمَنِ اللَّهِ - کی بعض دوسری تفسیریں بھی کی گئی ہیں۔ ۱۲

کیسے قرار دیا جاسکتا ہے اصل یہ ہے کہ سورہ مائدہ کی آیت مجمل ہے مقام احوال میں صرف ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الآخر کا ذکر کیا جاتا ہے اور مقام تفصیل میں پورے سلسلہ ایمانیات کا اظہار فرمادیا جاتا ہے چنانچہ سورہ تغابن میں تفصیل و احوال دونوں کی مثالیں موجود ہیں چنانچہ ایمانیات کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد ہوا۔

فَإِنَّمَا يُبَأِ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالشُّورُ
الَّذِي أَنْزَلْنَا نَاطِقًا لِّلَّهِ بِمَا
تَعْمَلُونَ خَمِيرٌ يَوْمَ يَجْعَلُكُمْ
لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذَلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنُ
(تغابن - ۱)

اس آیت میں اللہ اور رسول، قرآن اور قیامت، سب پر ایمان لانے کا حکم دیا ہے اور اسی کے بعد جب پورے مجموعے کی طرف ارشاد کرنا منظور ہو تو یہ طور احوال فرمادیا۔
وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا۔ جو کوئی یقین لائے اللہ پر اور کام کرے جلا۔
(تغابن - ۱)

یہ تو صرف دو مثالیں ہیں جن کے ذریعہ یہ دھکلانا مقصود ہے کہ آیات قرآنی کی تشریع و تاویل میں دوسری آیات پر نظر رکھنا اس قدر ضروری ہے؟ اور اس سے یہ بات بھی ظاہر ہو گئی کہ آیات قرآنی کے مفہوم کے تعین کیلئے محض عربی زبان کی واقفیت کافی نہیں ہے بلکہ مسائل قرآن پر غائر نظر ہونے کی ضرورت ہے اس لئے فہم قرآن کے ہر ہی کا دھوکی قبول نہیں ہو سکتا ہے، جو لوگ تراجم کی مدد سے قرآن مجید سے نفع اٹھانا چاہتے ہیں ان کی خدمت میں بھی عرض ہے کہ کسی واقف کار کی مدد سے یا کسی معتبر حاشیہ یا استند تفسیر کے

خود یہود کا ہیں منت ہے یا ساحران فرنگ کی ادنی سازی کا نتیجہ ہے۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ اس طرح سورہ آل عمران کی اس تشریع کے بعد سورہ بقرہ کی آیت بحث طلب باقی نہیں رہتی ہے۔ اسی طرح سورہ مائدہ کی آیت۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا فَبِشَّكْ جو مسلمان ہیں اور جو یہود کا ہیں اور
الظَّابِئُونَ وَالنَّصَارَى مَنْ آمَنْ بِاللَّهِ فرقہ صابئی اور نصاری پر جو کوئی ایمان لائے،
وَالْيَوْمُ الْآخِرُ وَعَلَى صَالِحَاءِ اللَّهُ پر اور روز قیامت پر اور عمل کرے نیک۔
كے متعلق اس زمانے میں یہ بحث پیدا ہو گئی کہ نجات کیلئے صرف اللہ پر ایمان کافی ہے،
پیغمبر و پیروی فرشتوں اور آسمانی کتابوں پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے، اس لئے کہ آیت مذکورہ
میں صرف ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الآخر کا ذکر ہے یہ بحث نتیجہ اسی غلط روی کا ہے کہ ایت
قرآنی کی تشریع میں دوسری متعلقہ آیات پر نظر نہیں کی جاتی۔

صورت تو یہ ہے کہ رسولوں پر ایمان کے انکار کو قرآن نے کفر قرار دیا ہے ارشاد ہوا۔
إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ جو لوگ مسکر ہیں اللہ کے اور اس کے رسولوں
وَيُرِيدُونَ أَنْ يَفْرُّوْنَ بَيْنَ اللَّهِ كے اور چاہتے ہیں کہ فرقہ نکالیں اللہ
وَرَسُولِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِسَبْعِينَ اور اس کے رسولوں میں اور کہتے ہیں ہم
لَمْ نَتَّهِنْ بِبَعْضٍ وَّيُرِيدُونَ أَنْ ہم
بَعْضُونَ کو اور چاہتے ہیں کہ نکالیں اس
لَمْ نَتَّهِنْ بِبَعْضٍ وَّيُرِيدُونَ أَنْ
تَتَخَذَ وَابْنَيْنَ ذَلِكَ سَبَبِيلًا ۵
أَوْ لِئِكَ هُمْ أَنَّكَا فِرُونَ حَقَّاط
اصل کافر۔
(نساء - ۲۱)

اس صریح ارشاد کے بعد سورہ مائدہ کی آیت سے رسالت وغیرہ پر ایمان کو غیر روحی

ساتھ قرآن کا ترجیح پڑھیں ورنہ بعض ترجیح کام طالعہ مفترت کے اندر شہر سے خالی نہیں ہے اس لئے کہ ترجیح میں ناسخ، منسون، بجمل مفصل ہطلق، مقید اور نزول آیات کے پس منظر دغیرہ کا کوئی ذکر نہیں ہوتا ہے اور ان چیزوں کے علم کے بغیر صحیح مفہوم اور مقصد تک سائی ممکن نہیں ہے۔

(۷)

قرآن مجید کے الفاظ کی تشریع اور آیات کے مفہوم کی تعین کے سلسلہ میں ارشادات بنوی صلی اللہ علیہ وسلم اور اقوال صحابہ و تابعین کا ذکر آیا ہے اس لئے ضروری ہے کہ تغیری کے روایتی حصے کے متعلق بھی کچھ عرض کر دیا جائے۔ تغیری روایات کے متعلق عجیب افزاط و تغیریط کا معاملہ ہے الیک طرف پچھا ایسے لوگ موجود ہیں جو تحقیق و تقدیر کے بغیر کتب تفاسیر میں نقل کی ہوئی ہر روایت پر ایمان لانے کیلئے تیار ہیں تو دوسرا طرف ایسے لوگ بھی ہیں جو تغیری کے پوئے روایتی حصہ کو شک اور شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حق ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ نہیں ہے۔ صحیح راستہ درمیان کا ہے یعنی محدثین نے روایات کی تحقیق و تقدیر کے جواصول مرتب فرمائے ہیں ان پر چور روایات پوری اُتریں وہ قبول کی جائیں ورنہ رد کر دی جائیں۔

تاریخی تیشیت سے تفسیری اثاث و روایات کے تین دور قائم ہو سکتے ہیں۔

(۱) پہلا دور حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ہے جن کو بارگاہ بیوت سے براہ راست فہم قرآن کا موقعہ ملا۔ ہر چند کہ حضرات صحابہ غموماً اہل عرب تھے اور انہیں کی زبان میں قرآن نازل ہوا تھا، مگر یہ فہم قرآن میں پہنچ کر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا پابند اور محتاج سمجھتے تھے کوئی لفظی یا آیت ان بزرگوں کی سمجھیں نہ آتی تو حضور سے دریافت فرماتے

خود سر در کوئین (صلی اللہ علیہ وسلم) آیات کی توضیح و تشریع فرمادیا کرتے تھے، اکابر صحابہ اپنی علمی علسوں میں بھی قرآن مجید کے متعلق بہت سے نکتے حل فرماتے قرآن کے غریب الفاظ کی شرح میں دیوان عرب سے کام لیتے۔ احکام قرآن پر غور فرماتے۔ مسائل کا استنباط کرتے شان نزول بیان فرماتے۔ اگر کسی کو غلط معنی اخذ کرتے یا بیان کرتے ہوئے دیکھتے تو اس کی اصلاح فرمادیتے۔

صحابہ کرام میں دس حضرات کو اس فن میں خاص امتیاز حاصل تھا۔

خلفاء راشدین، حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت ابو بن کعب، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابو موسیٰ اشری، حضرت عبد اللہ بن زبیر، رضی اللہ عنہم اجمعین

ان حضرات کے سوا حضرت انس، حضرت ابو ہریرہ، حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت جابر، حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص سے بھی تغیری روایات مروی ہیں مگر بہت کم، حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص کی مروایات زیادہ تر قصص اور اخبار و قلن سے متعلق ہیں۔

خلفاء راشدین میں سب سے زیادہ تغیری روایات حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہیں۔ حضرت علی کے بعد حضرت عبد اللہ بن عباس کی طرف مسوب ہیں۔ عہد صحابہ میں ایک تغیری جموعہ کا انتساب حضرت ابن کعبؓ کی طرف ہے۔ اس سے ابن جریر طبری نبکثر اخذ کیا ہے۔ حاکم نے مُستدرک میں نیز امام احمد بن حنبلؓ نے بھی اس سے اخذ کیا ہے۔ صحابہ کرام کے بعد ایام احمد بن حنبلؓ نے بھی اس سے اخذ کیا ہے۔ صحابہ کرام کے بعد ایام احمد بن حنبلؓ نے آئیں کہ اور کو فہرست تعلیم قرآن کے لئے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

کر محفل میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے تلامذہ حضرت مجاهد (۱۰۳ھ) حضرت سعید بن جبیر (۱۰۷ھ) حضرت عکرمہ (۱۰۸ھ) حضرت طاؤس (۱۱۴ھ) حضرت عطاب بن رباح (۱۱۳ھ) کافیض جاری تھا اور کوفہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود کے تلامذہ حضرت عقبہ بن قیس (۱۱۶ھ) حضرت اسود بن زید (۱۱۷ھ) حضرت ابراہیم نجفی (۱۱۹ھ) اور امام شعبی (۱۲۱ھ) خدمت دین میں معروف تھے۔

ان حضرات کے سوا اس عہد کے مشاہیر حضرت حسن بصری (۱۲۳ھ) عطاب بن ابی سلم خراسانی، محمد بن کعب القرطی (۱۱۱ھ) ابوالعلییہ رفعی بن مهران الرباحی (۱۱۹ھ) ضحاک بن مراحم (۱۲۰ھ) عطیہ بن سعید الحوفی (۱۲۱ھ) قتادہ بن دعامہ (۱۲۲ھ) ابوالملک نبی بن سالم بریع بن انس، مرہہ ہمدانی (۱۲۴ھ) کے نام قابل ذکر ہیں۔ صاحب کشف الطنون نے جن کتب تفسیر کا ذکر کیا ہے ان میں سے حضرت تابعین کی طرف جن کا انتساب ہے وہ یہ ہیں:-

(۱) تفسیر عکرمہ (۱۰۷ھ)، تفسیر عویضی (۱۰۸ھ)، تفسیر مجاهد (۱۰۸ھ)، تفسیر والبی (۱۰۹ھ)، تفسیر زید بن اسلم، ابن الوزیر سعید بن ایثار الحق میں حضرت عبداللہ بن عباس کے شاگرد علی بن طلحہ راشی کی تفسیر نیز تفسیر امام حسن بصری، تفسیر عطاب بن رباح، تفسیر محمد بن کعب القرطی کا ذکر کیا ہے۔

علی بن طلحہ کی تفسیر کے متعلق حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ اس کا ایک نسخہ امام یثث کے کاتب شیخ ابوصالح کے پاس تھا۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ یہ نسخہ مصر میں ہے، اگر کوئی شخص اس کیلئے مصر کا سفر کرے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے اسی وجہ سے ابو جعفر نجاشی (۱۲۸ھ) نے اپنی کتاب الناسخ والمنسوخ میں کافی اخذ کیا ہے۔ ابن حبیر

نے اپنی تفسیریں اس سے تحریک کی ہے۔

حضرت سعد بن جبیر کی طرف بھی ایک تفسیر شوب ہے جو تفسیر عطا بن دنیار کے نام سے مشہور ہے۔ اس دور کی تفسیری کوششوں کے متعلق امور ذیل لائق توجہ ہیں۔

(۱) اس دور کی تفسیر کا بلا سرما یہ حضرات صحابہ کرام کی روایات اور ایک تو قول ہیں خود تابعین بھی تلاش و تفصیل اور اجتہاد نہیں استنباط مسائل سے کام لیتے تھے، قرآن کے متعلق ان کی لغوی تشریحات کو امام بخاریؓ نے اپنے صحیح میں جمع کر دیا ہے۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عباس کے تلامذہ میں مجاهد کا بڑا مرتبہ ہے۔
حافظ ابن ثیمیہ کا بیان ہے۔

”مجاهد کی تفسیر پر اکثر ائمہ مثلًا ثوری، امام شافعی، احمد بن حنبل اور بخاری اعتماد کرتے تھے۔ امام ثوری کا بیان ہے کہ ”گرتم“ کو کوئی تفسیر مجاهد سے ملے تو بس کافی ہے۔

(تفسیر عویضی، اخلاص صفحہ ۹۲)

(۳) حضرت مجاهد کی عظمت اور جلالت علم کے باوجود ان کے دو قول کو ائمہ اہل تفسیر نے قبول نہیں کیا ہے۔ ایک مقام محدود کی تفسیر درسرے ایک ریتھانا ظریٹہ کی تفسیر۔ (۴) ہماحب فرالاسلام نے طبقات ابن سعد (جزء ۵ ص ۳۲۲) کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ بعض اہل علم کو مجاهد کے قول کرنے میں ناکام تھا، مگر اسی مقام پر خود ہی صحف فرالاسلام نے چھاہے کہ

”مجاهد کے صدق میں ہم کسی کو مترد نہیں پاتے“

لہ مراتۃ التفسیر ص ۱۱۷ میزان العدالت ترجیح عطا بن دنیار ۱۱۷ تفسیر روح المعانی (سورہ اسراء) آیت

(مسکی العینیہ بک ۱۱۷) لہ فرالاسلام ۱۱۷ ص ۲۵۲

(۵) حضرت مجاہد کو حضرت عبداللہ بن مسعود کی قرأت سے بھی بڑی مدد ملی وہ فرماتے تھے کہ حضرت ابن عباس سے استفسارات سے قبل اگر میں نے عبداللہ بن مسعود کی قرأت کو پڑھا ہوتا تبہت سے سوالات کی ضرورت نہ پڑتی۔ (الراوض الانف ج اوں صفحہ ۲۲۰)

(۶) حضرت عبداللہ بن عباس کی طرف جو تفسیری روایات مسوب ہیں ان میں سے بعض سندوں میں انقطاع پایا جاتا ہے مگر فی نفسه دھ معتبر ہیں۔ حافظ ابن تیمیہ نے اس سلسلے میں حسب ذیل نام لئے ہیں۔

سُدِّیٰ بَکِیر، ضَحْکَان، عَلَیٰ بْنُ ابِی طَلْحَةِ وَابْنِی، قَتَادَةَ۔
اور بعض سندوں ایسی ہیں جن میں صفت پایا جاتا تھا۔ مثلاً۔

(۱) جویر بن سعید عن الضحاک عن ابن عباس اس سنڈ میں جویر ضعیف راوی ہیں۔
(۲) عبید اللہ بن سلیمان عن الضحاک عن ابن عباس اس سنڈ میں عبید اللہ ضعیف راوی ہیں۔

(۳) محمد بن سعد العوفی عن آبائہ عن عطیۃ العوفی عن ابن عباس، اس سنڈ میں عطیۃ ضعیف راوی ہے۔
محمد السائب الکلبی، عن ابی صالح باذام عن ابن عباس، اس سنڈ میں باذام ضعیف اوکلبی کذاب ہے۔

ابن عساکر نے اپنی ناتخین میں کہا ہے کہ
بلکی کی کتاب التفسیر اس لائق ہے کہ اس کو دفن کر دیا جائے۔ ج۔ ص ۱۱۶
حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں۔
کلبی، سدی، صغیر اور مقائل بن سلیمان متذکر ہیں۔

یہی بات صاحب کشف الطعون نے بھی کہی ہے۔

حضرات تابعین کے بعد تبعیت تابعین کا دور آتا ہے ان کا اصل کار نامہ اقوال صحابہ و تابعین کا جمع کرنا اور ان کی اشاعت ہے۔ دوسری روایات کو بھی انہوں نے جمع کیا ہے لیکن جمع و تقدیم کے لگتے ہے۔ (الآمَانَةُ لِلَّهِ)
اس سلسلہ میں قابل ذکر حضرات یہ ہیں۔

سفیان بن عیینہ (۷۸۰ھ) دیکھ بن الجراح (۷۹۶ھ) شعبہ بن الجراح (۷۶۴ھ)
اسحاق بن راہمیہ (۷۳۷ھ) بزید بن ہارون اسلمہ (۷۳۷ھ) عبدالرزاق بن ہمام (۷۳۷ھ)
آدم بن ابی ایاس (۷۳۷ھ) روح بن عبادہ (۷۲۵ھ) سید بن داؤد (۷۲۷ھ) ابوکبر بن
ابی شیبہ (۷۳۷ھ) عبد بن حمید (۷۳۹ھ) ابن وصب (۷۹۹ھ)۔

اس دوہیں تفسیری دائرے کے کوہت و سعت ہوئی، بہ کثرت روایات کا سلسلہ پھیلا
صاحب کشف الطعون نے جن تفسیروں کا ذکر کیا ہے ان میں سے ذیل کی تفسیریں اس دوہیں۔
(۱) تفسیر ابن جریح (۷۵۱ھ)، (۲) تفسیر مقائل (۷۵۱ھ)، (۳) تفسیر آدم بن ابی ایاس
(۷۳۷ھ)، (۴) تفسیر شعبہ بن الجراح (۷۶۴ھ)، (۵) تفسیر عبدالرزاق بن ہمام (۷۳۷ھ)، (۶)
تفسیر عبد بن حمید (۷۳۹ھ)، (۷) تفسیر دیکھ بن الجراح (۷۹۶ھ)، (۸) تفسیر بزید بن ہارون (۷۳۷ھ)
(۹) روح بن عبادہ کے متعلق تہذیب میں جمع تفسیر کا ذکر ہے (۱۰) ابوکبر بن ابی شیبہ کی تفسیر
کا ذکر خطیب کرتے ہیں۔ (۱۱) سید بن داؤد کو بھی صاحب تفسیر ماجمل ہے (۱۲) تفسیر سفیان ثوری
(۷۹۷ھ)، (۱۳) تفسیر امام مالک (۷۹۷ھ)

تفسیر امام مالک کے متعلق شک ہے کہ یہ خود امام صاحب کی تالیف ہے یا کسی شاگرد نے
لهمۃ التفسیر ۷۸۰ھ کتب خانہ را پوریں موجود ہے سلیمان مترک صفحہ ۲۸۸۔

ام صاحبے اس کی تعلیق کی ہے۔

ان تمام تفسیروں کے متعلق یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ان میں سے کوئی مجموعہ
بہ ترتیب مصحف تمام قرآن کی تفسیر نہ تھا بلکہ صورت یہ تھی کہ جس کے پاس تو تفسیری روایات
تفسین وہی تفسیری مجموعہ کی شکل میں آگئیں ہاں سے سامنے بہ ترتیب مصحف قرآنی کی پہلی اور جامع
تفسیر ابن جریر کی ہے۔ ابن جریر نے تمام تفسیری ذخیروں کو جو ان کے عہد میں تحریر یا زبانی طور
پر موجود تھا اپنی تفسیر میں جمع کر کے ان کو دست برداشنا نے محفوظ کر دیا چنانچہ ذیل کے مأخذ
آن کی تفسیر کا اصل قرار پائے۔

(۱) کتب تفسیر مصنفہ عن عبداللہ بن عباس (۲) کتب تفسیر عین سعید بن جبیر (۳) مجاهد
(۴) قتادہ بن دعامة (۵) حسن بصری (عکرمہ) (۶) ضحاک بن مزاہم (۷) عبداللہ بن مسعود
(۸) تفسیر عبد الرحمن بن زید اسلم (۹) ابن جریر (۱۰) تفسیر مقاتل ، ان کتابوں کے سوا
دوسری احادیث مشہورہ و مندرجہ بھی حسب فضروت ذکر کی گئی ہیں۔
تفسیر ابی بن کعب اور تفسیر علی بن طلحہ کے متعلق اور ذکر آچکا ہے کہ ابن جریر نے ان کو
ابنی تفسیر کا مأخذ بنایا ہے

تفسیری آیات و روایات کے یہ تین اہم دور تھے، جن کو اختصار کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے
اس سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین رہنا چاہیے کہ تفسیری روایات میں بھی حدیث کے عام قاعدہ
کے مطابق سند کی بڑی اہمیت ہے اگر سند کے اعتبار سے کسی روایت میں نقش نہیں ہے تو اس
کے قبول کرنے میں تامل نہ کرنا چاہیے اور اگر سند یہ حیثیت کر دو رہے تو وہ روایت اسی مرتبہ پر
لکھنے کے لائق ہے جس کے وہ قابل ہے اسی لئے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی

تفسیر ابن جریر کو جو کہ تفسیری روایات کا سب سے اہم ذخیرہ ہے تک حدیث کے طبقہ بچاہم میں
رکھا ہے اور اس طبقہ کی کتابوں کیلئے فرمایا۔

”اگر کسی کو ان کتابوں کی تحقیقیں کا شوق ہو تو اس کو چاہیے کہ ان کے روایوں کا
حال حکوم کرنے کیلئے ذہبی کی میزان الصعفار اور ابن جر عقلانی کی ران
المیزان سامنے رکھے اور غریب الفاظ کی شرح اور عبارتوں کے مفہوم متعین کرنے
کیلئے محمد طاہر (جگراتی) کی مجمع البخاری سے استفادہ کرے۔

(عمالہ نافعہ)

قرآن مجید کی زبان عربی ہے اسلئے قرآن مجید سے استفادہ کرنے والے کے لئے عربی
زبان کی واقعیت سے چارہ نہیں، لیکن یہ بات کبھی نہ فراموش کرنی چاہیے کہ زبان کے معاملہ
میں قرآن مجید کا معيار اس قدر بلند ہے کہ علمائے اسلام کی ایک بڑی جماعت نے قرآن مجید کی
فضاحت و بلافت ہی کو اس کے ابعاز کی اصلی وجہ قرار دیا ہے، اسلئے قرآن مجید کے الفاظ
اس کے جملوں اور اس کی ترکیبوں کے سلسلہ میں بعض سطحی معلومات پر بھروسہ نہ کرنا چاہیے بلکہ
عربی لغت اور اس کے اسالیب بیان کے اعلیٰ ماذکو بیش نظر کھانا چاہیے تاکہ قرآن مجید
کے مضامین سے صحیح استفادہ ہو سکے! اس سلسلہ میں حسب ذیل اشارات خاص طور پر
لائق توجہ ہیں۔

(۱) قرآن مجید کے الفاظ کی تشریح کے لئے اہل علم نے دو طریقے اختیار کئے ہیں۔ بعض
نے تمام الفاظ کا اصطہان کیا ہے اور ان کا نام مفردات القرآن رکھا ہے، مثلاً مفردات
القرآن، امام راعب اصطہانی۔ ایک جماعت نے صرف مشکل لغات پر اتفاقاً کی اور اس کو

صلات و حروف روابط معنی میں کیا اثر پیدا کرتے ہیں الفاظ کی تقدیرم و تاخیر، تعریف و تنکیر، اطلاق و تقدیر وغیرہ سے معانی میں کیونکر اثر پیدا ہوتا ہے، ان نام امور کی واقفیت کے بغیر قرآن کے مطالب سمجھنا غیر ممکن ہے اسلئے علمائے ادب نے جن کو اس موضوع پر قلم اٹھانے کا سبجے زیادہ حق تھا ان مباحث پر معانی قرآن کے نام سے بکثرت تابیں لکھیں۔ قرآن کے طالبعلم کو اس فن سے واقفیت ضروری ہے۔

(۵) جولناظ جس معنی کیلئے بنایا گیا ہے، اگر اسی میں اس کا استعمال رہے تو اس کو حقیقت کہتے ہیں اور اگر اس عام اور معروف وضع کے ذریعہ سے اس کے مناسب اور غیر مرفت معنی کو ادا کیا جائے تو اس کو مجاز کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں بہت ہا مجازات ہیں اور مفسر کیلئے ان سے واقفیت ضروری ہے، ہفتینہن اسلام نے مجاز القرآن کے نام سے مستقل تابیں لکھی ہیں۔ سلطان العلام عبدالرہمن بن عبد السلام (۶۷۲ھ) کی الاشارة الی الایجاد فی بعض انواع المجاز اس فن کی بہترین تصنیف ہے جس میں نہایت استیعاب کے ساتھ

لعله صلات کا معانی پر جو اثر پڑتا ہے اس کا اندازہ آیت (وَإِذَا فَتَأْكِمُ الْحَرْثَ) اور (وَهَذَا
ياد کرد) جب ہم نے تمہارے لئے سعدر کو پچاڑ دیا تھا۔ (بقرہ) سے کرنا چاہیئے اس آیت پر ایک ظاہری اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ قرآن مجید اپنے عہد کے بنی اسرائیل سے کہہ رہا ہے کہ ہم نے تمہارے لئے دیا کوچھاڑ دیا تھا حالانکہ یہ واقعہ ان کے اسلاف کے ساتھ پیش آیا تھا اس اشکال کے مناسب جوابات دیئے گئے ہیں سیکن صاحب روح المعانی نے کہہ ہے کہ اگر "لکھم" ہوتا تو اس سے عہد نبوی کے بنی اسرائیل مراد ہوتے اور "ب" سے حلیریعنی "بکم" کے معنی ہیں کہ تمہارے اسلاف کیلئے دیا کوچھاڑ دیا تھا۔ اس طرح بعض حد کے فرق کے باعث کوئی اشکال نہیں وارد ہوتا ہے
(روح المعانی ج اول ص ۲۲۲)

غريب القرآن کے نام سے موسم کیا۔ اس فن پر علماء حنود ادب نے کثرت سے تابیں لکھی ہیں لیکن اس باب میں سب سے زیادہ کاؤش قتلاش ابن درید (۷۰۰ھ) اور اُن کے شاگرد غفرزی نے کیا ہے۔ ان دونوں استاد اور شاگرد نے غريب القرآن کی تدوین میں پورے پندرہ برس صرف کئے۔

(۶) قرآن میں اکثر ایک لفظ متعدد مقامات میں مختلف معنی رکھتا ہے۔ اہل بلاغت اس لفظ کو مشترک کہتے ہیں لیکن علوم قرآن میں اس کو "نظائر" کہتے ہیں اور بعض الفاظ ایسے ہیں جو متعدد مقامات پر مستعمل ہوتے ہیں اور ہر جگہ ان سے ایک ہی معنی مراد ہیں علماء قرآن اس کو "وجوه" کہتے ہیں۔ "وجوه و نظائر" کی واقفیت فهم معانی قرآن کیلئے نہایت ضروری ہے تاکہ معنی بچھنے میں اشتباہ نہ ہو اس بنا پر علماء اسلام نے "وجوه و نظائر" کی توضیح تحقیق کیلئے مستعمل تابیں لکھی ہیں۔ حافظ جلال الدین سیوطی کا رسالہ "معک الاترائق"، فی مشترک القرآن، اسی فن میں ہے۔

(۷) عربی زبان میں اجزاء کلام کے باہمی ارتباط و تعلق کے اظہار کیلئے اعراب (یعنی آخری حرف میں زیر، زبر، پیش) کا استعمال ہوتا ہے انہیں اعراب کے ذریعہ سے عربی زبان میں فاعل، مفعول، مضار، مضارف، الیحال، تمیز، وغیرہ کا انتیاز ہوتا ہے اسلئے ظاہر ہے کہ فہم معنی کیلئے اعراب کی واقفیت کی کس قدر ضرورت ہے، علمائے اسلام نے یہ ضرورت بھی پوری کر دی ہے قرآن مجید کے اعراب پر مشتمل تابیں تصنیف کی ہیں جن میں عوام ایک ایک سورہ کو بدترتیب لے کر ان کے اعراب کی تحقیق کی گئی ہے،

(۸) قرآن مجید جن مطالب پر مشتمل ہے اُن کو کن طریقوں سے ادا کیا گیا ہے؟ اور اس سلسلہ میں کن مختلف صلات و حروف روابط کو استعمال کیا گیا ہے؟ مختلف

قرآن کی آیات کا استقصار اور اس کے معانی کی تشریح کی گئی ہے۔

(۴) بہت معانی اور مطالب ایسے ہیں جو عام نظروں سے پوشیدہ ہیں اور جن کی تشریح و توضیح کیلئے ایک دفتر درکار ہوتا ہے لیکن سب آسان منفرد اور بہتر صورت اس کی یہ ہے کہ ان کو تشبیہ کے ذریعہ ادا کیا جائے یعنی ان کو ایسے معانی اور مطالب کے مقابلہ قرار دیا جائے جو عام طور پر معلوم ہیں اور نظروں کے سامنے ہیں، تاکہ مخاطب ان واضح اور ظاہر معانی سے بواسطہ مشابہت فہمی معاون تک پہنچ جائے۔ اسی کو تشبیہ کہتے ہیں۔

قرآن مجید نے بھی تشبیہات کا استعمال کیا ہے اور ان تشبیہات پر، عام کتب بیان نہیں معانی القرآن، فنِ اجماد القرآن اور فنِ مجاز القرآن میں کامل بحثیں موجود ہیں۔

جن کام طالع طالب قرآن کے لئے ناگزیر ہے۔

(۵) قرآن مجید میں ایک ہی مادہ، مختلف ابواب سے استعمال ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ ابواب کا یہ تغیر کریں ممکنی افادہ سے خالی نہیں

اس سلسلہ میں اصولی بات یہ ہے کہ الفاظ کی زیادتی و قوت کو معنی کی قوت اور اہمیت میں بہت ہی زیادہ دخل ہے جیسا کہ مصنف طراز فرماتے ہیں۔

”معنی میں زور و قوت کا جو ظہور ہوتا ہے وہ الفاظ کی وجہ سے ہوتا ہے اور الفاظ میں یہ قوت صیغوں کے روبدل کی وجہ سے آتی ہے اگر ایسا نہ ہو گا اس لئے معنی میں قوت پیدا کرنے کے لئے الفاظ کی زیادتی لازمی ہے“

مزید وضاحت کے لئے چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

علام الخیوب اور عالم الغیوب میں بہت فرق ہے۔ علام زیادہ جاننے والے کو کہیں گے اور عالم صرف جاننے والے کو، اسی طرح **يَحْبُّ الْمُتَّوَابِينَ** اور **يَحْبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ**۔ میں جو زوبیان پایا جاتا ہے وہ تائبین اور ظاہرین میں نہیں پایا جاتا کیونکہ تو اب ہم وہ وقت توبہ کرنے والے کیلئے مستعمل ہے اور تا صرف توبہ کرنے والے کو کہتے ہیں۔^{۱۷}

(۱) ایک آیت ہے۔ **فَمَا أَسْطَاعُوا أَنْ يَظْهِرُوا كُوْمَا**
أَسْتَطَاعُوا لَهُ لَقْبًا اس میں بھی الفاظ کی زیادتی سے معنی میں تبیان
 واقع ہو گئی ہے، کیونکہ ”ت“ حروف شدت میں سے ہے اور اسی وجہ سے
 واضح ہو گیا کہ اہم مہم اور سخت کام کے لئے استطاع کا الفاظ مستعمل ہو گا، اور
 آسان و ہل کام کے لئے اس طارع کیونکہ **فَمَا أَسْطَاعُوا أَنْ يَظْهِرُوا**
كُوْمَا کے معنی یہ ہے کہ اپنے ضحف کی وجہ سے وہ اس پر غلبہ نہ کر سکے۔
 اور **مَا أَسْتَطَاعُوا لَهُ لَقْبًا** کے معنی یہ ہیں کہ شدت اور سختی کی وجہ
 سے وہ سوراخ نہ کر سکے۔^{۱۸}

(۲) دوسری آیت **عَلِيهِ اللَّهُ أَنْتُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ**
أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْ حَكْمٍ میں
 ”تختانون“ کا باب افتتاح سے آتا ہے تھی پر معنی ہے۔ بظاہر آیت ہر یہ بتا رہی ہے کہ صحابہ کرام (نحوہ بالش) خیانت کے مرتکب ہوتے تھے لیکن فرق خالہ نے تو اسی آیت کو لے کر صحابہ کرام کے خلاف طعن و تشنیع کیا۔

مہم شروع کر دی۔ لیکن جب لفت پر نظر ڈالی گئی تو قرآن کے اعجاز کا قابل ہونا پڑا کیونکہ اختیان کہنے ہیں خیانت کا ارادہ کرنے کو! یعنی خیانت کے خیال اور تصویر کو اختیان کہا جاتا ہے اور خیانت کرنے کے معنی میں جو لفظ مستعمل ہوتا ہے وہ یخُنُونَ ہے نہ کہ یخْتَانُونَ اور خیانت کا تصور و خیال کوئی بُری بات نہیں ہے کیونکہ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے اَنَّ النَّفْسَ لَا مَارَةٌ لِّا سُوْءٌ (نفس ہی برائیوں کی طرف کشتنے سے راغب کرتا ہے)۔

حاصل یہ کہ قصد عمل دوسری چیز ہے اور صد و فعل دوسری چیز! قرآن مجید کا اشارہ قصد ہی کی طرف ہے صدور کی طرف نہیں اسلئے یہ آیت صحابہ کرام کے مناقب کے ذیل میں آتی ہے کہ باوجود قصد کے ان سے اس کا ارتکاب نہیں ہوا۔

(۳) الشَّاعِلُ اپنے لطف و کرم کا اٹھا کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا أَكْتَسَبَتْ ۔ یعنی ان کو کارخیر میں توشاب مل جائے گا لیکن سزا اسی وقت ملے گی جب کوئی گناہ قصد اسزد ہوا ہو۔ اتنا عظیم فرق صرف اس ایک "ت" کی زیادتی سے پیدا ہو گیا، حالانکہ دونوں کا مادہ ایک ہی ہے اس لئے کہ اکتسبت باب افعال سے ہے جس میں قصد و ارادہ ضروری ہے۔

(۴) حضرت زکریا کے بائے میں ارشاد ہوا۔

سَيِّدًا وَحَصُورًا وَنَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ۔ حصر کے لغوی معنی روکنے کے ہیں حصوراً سے مشتق ہے لیکن یہ مبالغہ کا چیز ہے اس لئے اس کے اور حصر کے معنی میں بالکل مغایرت ہو گی۔ علامہ خطا جی فرماتے ہیں۔

»حصوہ مبالغہ کا چیز ہے اور مبالغہ صرف اختیاری افعال ہی میں پایا جاتا ہے لہذا حصوہ کے معنی ہیں "قدرت کے باوجود حصوہ رہنا" اس لئے معلوم ہوا کہ زکریا علیہ السلام مجبوراً مخصوص نہیں تھے بلکہ ان کا یہ اپنا اختیاری فعل تھا۔

(۵) سورہ قدر میں ارشاد ہے:-

تَنَزَّلُ الْمُلْكَةُ وَالرُّوحُ

اس شب میں ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ تنزل باتفاق سے ہے جس کی خاصیت تدریج ہے۔ یعنی کسی شے کا آہستہ آہستہ پورا ہونا مصنف فتوحات الہمیہ فرماتے ہیں:- «رَبُّتْ سے بظاہر پر معلوم ہوتا ہے کہ تمام فرشتے اس شب میں دنیا میں آجائتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس شب میں فرشتوں کا اُترنے کے باۓ میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں لیکن تنزل کا لفظ لاکر فرشتوں کے نزول کی نوعیت متعین کر دی کہ وہ یک بیک نہیں ازتے رہتے بلکہ جو حق در جو حق یکے بعد دیگرے ازتے رہتے ہیں جس طرح جماج جو حق در جو حق خاتمة کعبہ کی حاضری کیلئے آتے ہیں۔»

(۶) منافقین کے باۓ میں خدا کہتا ہے۔ وَجَاءَ الْمُعَذِّرُونَ مِنَ الْأَعْذَابِ۔

یہاں معذرون نہیں فرمایا کیونکہ ان دونوں میں بہت فرق ہے۔ مُعَذِّر صرف اس شخص کے لئے استعمال کیا جانا ہے جو معذور نہ ہو مگر خواہ مخواہ اپنے آپ کو معذور گردانے اور معذر صحیح اور غیر صحیح دونوں قسم کے عذروں کے لئے آتا ہے۔ قرآن نے

مُعَذِّرُونَ کا لفظ استعمال کر کے یہ بتا دیا کہ ممن افتقین حقیقتاً مخذلہ نہیں تھے لہ

(۴) وَعَلَى الَّذِينَ يُطْبِقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامٌ وَسِكِّينٌ۔ اس آیت کے تفسیری مباحث اہل علم کے سامنے ہیں لیکن یُطْبِقُونَهُ کے باب افعال سے آنے کے اسرار پر غور کیجئے تو بحث کس قدر انسان ہو جاتی ہے۔ باب افعال کی ایک خاصیت سلب ماذنے سے اسلئے یُطْبِقُونَهُ کے معنی لَا يُطْبِقُونَهُ ہوئے اب مفہوم میں کسی قسم کا اشکال نہیں رہا یعنی جو روزہ کی طاقت نہ رکھتے ہوں وہ اس کے بد لے فریہ ادا کریں۔

لسان العرب کے صفت فرماتے ہیں کہ طوق اور اطاقت مشقت یا تکلیف کے ساتھ طاقت رکھنے یا برداشت کرنے کو کہتے ہیں تو اب آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ جو لوگ روزہ رکھنے پر قادر تو ہیں لیکن اس میں انہیں مشقت اور تکلیف ہوتی ہے تو وہ اپنے رونے کے لئے فریہ ادا کریں۔

اسی مفہوم کی تائید میں شرح ابو داؤد میں اس آیت کی تفسیر میں اطاقت کے مننی یہ لکھے ہوئے ہیں کہ وہ لوگ جو روزہ رکھنے پر مشقت و تکلیف کے ساتھ قادر ہوں ان کو اجازت ہے کہ وہ روزہ نہ رکھیں بلکہ اس کے بد لے میں فریہ ادا کریں۔

(۹)

تصریحات بالا سے یہ بات واضح ہو گئی کہ قرآن شریعت کی تفسیر کا اصلی طریقہ یہ ہے کہ آیات فرقانیہ کی توضیح قرآن ہی سے کی جائے۔ اس کے بعد احادیث صحیح کو پیش نظر رکھا جائے اور اگر زبان عرب کے قواعد کی پابندی اور اصول شریعت کی مطابقت کے ساتھ قرآن مجید کے معانی بیان کئے جائیں تو وہ بھی تفسیر کا صحیح طریقہ ہے اور اگر آیات فرقانیہ کے

مطلوب کے بیان کرنے میں اصول شریعت اور قواعد زبان عرب کا محاط نہ کیا جائے تو بینا مجاز ہے اور اسی کو "تفہیر بالرائے" کہتے ہیں۔

ترنہی شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"جو شخص قرآن میں اپنی رائے سے کہے تو چاہیے کہ وہ اپنا مٹھکا نا دوزخ میں ڈھونڈ لے ॥"

اور دوسری روایت میں ہے کہ

"جو شخص قرآن میں بغیر علم کے کچھ کہتا تو چاہیے کہ وہ اپنا مٹھکا نا دوزخ میں ڈھونڈ لے ॥"

بیہاں علم سے مراد قواعد عربیت اور اصول شریعت کا علم ہے بے شریخ شخص ان دونوں علوم سے موافق ہے اس کو قرآن شریف کی تفسیر کرنا حرام ہے۔ علامہ شاطبی نے موافقت میں صحیح فرمایا کہ

"رائے کی دوسریں ہیں ایک وہ رائے جو کتاب سنت کے مطابق اور قواعد زبان عرب کے موافق ہو۔ اس رائے سے اعراض و غفلت ممکن نہیں ہے۔" دوسری رائے وہ جو نہ دلائل شرعیہ کے موافق ہے اور نہ زبان عرب کے قواعد کے مطابق ہو تو بے شریخی ہی رائے قابل مذمت ہے ॥

(۱۰)

جصاص رازی نے احکام القرآن میں فرمایا کہ "حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد من قال في القرآن برأيته فاصاب جو شخص قرآن میں اپنی رائے سے کچھ کہے وہ اگر صحیح بھی کہے تو غلط ہے۔ فقد اخطاء۔

اس شخص کے متعلق ہے جو قرآن کی تفسیر میں اصول سے بہت کروہ بات کہے جو اس کے خیال میں آجائے اور اگر کوئی شخص (آیات قرینہ کا) مطلب بیان کرے اور اس کو ایسے معانی پر مgomول کرے، جن پر سب کااتفاق ہے تو وہ شخص قابل تعریف ہے، اجر کا متحقق ہے اور ان لوگوں میں سے ہے جن کے متعلق خدا نے ارشاد فرمایا:-

لَقَلِيلُهُمَا الَّذِينَ يَسْتَطُونَهُ مِنْهُمْ۔ (ج ۲ ص ۸۸)

(۱۰)

قرآن مجید کے طالبعلم کے لئے ضروری ہے کہ اس کو قرآن مجید میں جن قوموں کا ذکر آیا ہے اور جن مذاہب سے خطاب فرمایا گیا ہے اُن سے نیز عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ سے گھری واقفیت ہو۔ یہ مطالعہ جتنا گہرا ہوگا اسی قدر آیات قرآنیہ کا صحیح انکشاف ہو گا۔

صورت یہ ہے کہ قرآن مجید نے اپنے زمانہ نزول کے چار گمراہ فرقوں، مشرکین، بیہود، نصاریٰ اور منافقین کو خصوصی طور سے مخاطب کیا ہے اُن کے عقائد پر تنقید کی ہے اور اعمال و اخلاق کی پرداز دری کی ہے، اب جس شخص کو ان فرقوں کے عقائد کی قفیت نہیں ہے یا جس کی نگاہوں میں ان کی اخلاقی اور سیاسی زندگی نہیں ہے وہ متعلقہ آیات میں اسلوب بیان اور طرز خطاب کی اہمیت اور استدلال کی قوت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا ہے۔

اسی طرح قرآن مجید نے مسلمانوں کو خطاب کیا ہے۔ عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات میں اُن کی رہنمائی کی ہے۔ غزوات اور اس وقت کے اہم واقعات کا ذکر فرمایا ہے۔ اب اگر زمانہ نزول قرآن کی تبلیغ سے کوئی شخص ناواقف ہے تو وہ آیات کو ان کے صحیح

عمل پر نہیں رکھ سکتا ہے بلکہ ان دینی شریعت کی موقع پر غلطی کا ارتکاب نہ ہو جائے۔

اسی لئے امام شاطبی نے موافقات (ج-۳) میں فرمایا، کہ

”جو شخص قرآن مجید کو سمجھنا چاہے اس کیلئے نزول کی معرفت ضروری ہے“

اس اصول کی تشریح کرتے ہوئے امام شاطبی نے بڑی سطیف بات کہی کہ فن معانی و بیان کی بنیاد اس پر ہے کہ نفس خطاب مخاطب کرنے والے اور جن کو مخاطب کیا گیا ہے، اس کے متعلق صحیح معلومات ہوں، اسی کو مقتضائے حال کہتے ہیں۔ اسباب نزول کی واقفیت کا مطلب اسی مقتضائے حال کا جانتا ہے، شاطبی نے کہا بسا اوقات اس مقتضائے حال سے ناواقفیت سخت اشکالات کا باعث بنتی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ نزول قرآن کے زمانے میں مسلمانوں کے حالات اور قرآن کے مخاطب فرقوں کے عقائد رسم اور عادات سے ناواقفیت ازبس ضروری ہے۔ امام شاطبی نے فرمایا کہ:-

”(طالب قرآن کو) عادات عرب سے ناواقفیت بعض اوقات ایسی مشکلات میں ڈال دیتی ہے کہ اس سے بخات کی شکل اس کے سوا بکھار اور نہیں ہوتی کہ اس ناواقفیت کو دور کیا جائے“

(۱۱)

دوسرے مذاہب کے ائمے والوں نے بھی قرآن کا مطالعہ کیا ہے مگر ظاہر ہے کہ بالعموم ان کا نظر، نظر اعراض، یا قرآنی آیات اور قرآنی الفاظ کو اپنے کسی مطلب کے لئے استعمال کرنا اور مسلمانوں کو فریب دینا ہوتا ہے اس لئے قرآن مجید کے طالبعلم کو اس باب میں بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے، وضاحت کی غرض سے ہم اس

مسئلہ کی صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

قرآن پاک میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ”اللہ کا کلمہ“ کہا گیا ہے ارشاد فرمایا اور **کلیتہ القاھاری مزیدہ (نام)** اور اللہ کا کلمہ ہیں جس کو اللہ نے مریم نے پنجیا عیسائیوں نے مسلمانوں کو اس لفظ سے ہمیشہ کسی نہ کسی فریب میں بنتلا کر ناجاہا ہے۔ عباسی عہد کے فتنہ مغلق قرآن میں بھی اسی لفظ کا تماشا نظر آتا ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ اہل سنتہ والجماعت کا عقیدہ ہے کہ کلام اللہ غیر مخلوق ہے نصاریٰ اس پر اعتراض کرتے تھے کہ جب کلام اللہ غیر مخلوق ہے تو ”یسوع“ جو کلمہ اللہ ہیں وہ بھی غیر مخلوق ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ معتبر لکھ کو کلام اللہ کے مخلوق ہونے پر جو اس قدر راصراً حقاً وہ عیسائیوں کے اسی اعتراض سے بچنے کی بنا پر رکھتا۔

وچھپ بات یہ ہے کہ نصاریٰ کلمہ اللہ کے لفظ سے حضرت مسیح علیہ السلام کے غیر مخلوق ہونے پر استدلال کرتے تھے اور جہیبیہ اسی لفظ سے قرآن کے مخلوق ہونے کو ثابت کرتے تھے ان کا استدلال یہ تھا کہ قرآن نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمہ اللہ ہیا ہے اور حضرت عیسیٰ مخلوق ہیں نتیجہ یہ نکلا کہ کلام اللہ بھی مخلوق ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے نصاریٰ او جہیبیہ دونوں کے قول کو رد کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ”حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف جن امور کا انتساب کیا جاتا ہے ان کا انتساب قرآن کی طرف ممکن نہیں ہے۔ حضرت عیسیٰ بچہ تھے جو ان ہوئے کھاتے پیتے تھے۔ امر و نبی کے مخاطب تھے حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ پھر کیا

لہ الجواب ایصحاب بن تیمیہ ج اوں صفحہ ۳۴۷ صدر۔ ملکہ کتاب الرد علی الجہیبیہ امام احمد بن حنبل۔

قرآن مجید کے متعلق ان امور کی نسبت ممکن ہے؟

مطلوب یہ ہوا کہ قرآن پاک اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایک دوسرے پر قیاس کرنا درست نہیں ہے۔ باقی رہا قرآن مجید کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ”کلمہ اللہ“ کہنا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ”کلمہ کُن“ سے پیدا ہوئے نہ یہ کہ وہ خود کلمہ تھے۔ اصل قہتری یہ ہے کہ عیسائیوں نے جب لپٹے صحیح دین کو طہوریا اور دوسرے مذہب نیز اپنی فلسفہ کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا تو عیسیٰ مسائل میں ایسی لپک پیدا کرنا شروع کروئی کہ ہر مذہب و مسلک کے لوگ ان کے دین میں گناہش پا کیں چنانچہ انہوں نے دیکھا کہ فلاسفہ مدعقل، عاقل اور معقول کے اتحاد کے قائل ہیں تو انہوں نے بھی یاد بیٹھے اور روح القدس کا نقش اپنے بیہاں ٹھیکنے لیا۔

غالص یونانی فلسفہ لوگس (LOGOS) کے نام سے ایک اولین ہستی کو تسلیم کیا ہے جس کو اللہ نے تمام کائنات کی پیدائش کا ذریعہ بنایا ہے اسی کو فلاسفہ، عقل، اول، سے تغیریکرتے ہیں۔

عیسائیوں نے لوگس کے تھیل کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پڑھپاں کر کے بت پرست یونانی فلسفیوں کو دین عیسیٰ میں شامل کرنے کی کوشش کی لیکن اس اندر تقلید میں وہ خود مگراہ ہو گئے۔

عیسائیوں نے فلاسفہ کی طرح جب مسلمانوں کو اپنے دام میں لانا چاہا تو لوگس کی اس تھیل کو قرآنی لفظ کلمہ اللہ کے ذریعہ سے ادا کرنا چاہا۔

ظاہر ہے کہ قرآن نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا کلمہ جو کہا ہے اسکو عیسائی

اس آیت میں یہ پوری بات (أَن لَّا تَعْبُدَ إِلَّا اللَّهُ أَنْجَحَكُمْ) کلمہ ہے۔

یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی پر موت
اختی اذ احْياءً أَحَدَهُ هُمْ
الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونَ لَعَلَّيْ
آتَيْتُكُمْ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ مُتَّكِلًا إِنَّهَا
أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ مُتَّكِلًا إِنَّهَا
كَلِمَةٌ هُوَ قَاتِلُهَا ۝ (وَمِنْ ۚ)
رمبھوں، اس میں نیک کام کروں، "ہرگز نہیں"
بیشک وہ ایک بات ہی ہے جس کو وہ کہے
جاری ہے۔

یہاں قول رب اسْرِيْجُونَ لَعَلَّيْ أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ
کلمہ ہے۔

لفظ کلمہ کے دوسرا معنی "طشدہ بات" امر مقدر کے ہیں یعنی وہ بات
جو علم آئی میں پہلے طے ہو چکی ہے۔ آیات ذیل اس کی شاہد ہیں۔

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتَنَا لِعِبَادِنَا
أوہ ہے خاص بندوں یعنی پیغمبروں کے لئے
الْمُرْسَلِينَ طَإِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَصْوُرُونَ
ہماری بات پہلے ہی سے مقرر ہو چکی ہے کہ
وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ۔
بیشک دبی غالب کئے جائیں گے اور ہمارا
ہی شکر غالب رہتا ہے۔
(صفات ۵)

معلوم ہوا کہ یہ بات کس پیغمبروں کو کامیابی اور خداوندی شکر کو غلبہ ہو گا۔ پیشتر
ہی اس کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اسی کو سبقت کلمتنا سے ادا فرمایا۔

كَذَلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتَ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ
اسی طرح تمام کافروں پر آپ کے رب کی یہ بات
كَفُرُوا أَنَّهُمْ أَصْحَبُ النَّارِ۔
ثابت ہو چکی ہے کہ وہ لوگ دوزخ ہوں گے۔
(مومن ۶)

عقیدے سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ خود اصل دین عیسیٰ بھی اس سے بری ہے،
عیسائیوں نے کلمۃ اللہ کے تحت میں جتنے عقیدے پیدا کئے ہیں وہ سب کے سب مفتر
اور یوں آن کے بت پرست فلاسفہ سے ماخوذ اور توحید کے خلاف ہیں۔

قرآن میں کلمۃ اللہ کا مفہوم | اب دیکھنا چاہیے کہ قرآن پاک نے "کلمہ" کو
کس معنی میں استعمال کیا ہے؟

قرآن پاک نے کلمہ کا اطلاق ایک "قول تام" پر کیا ہے۔ یہ قول تام ہمیں صرف
بات کے معنی میں ہے۔ ارشاد ہوا۔

(۱) وَيُنْذِرَ الَّذِينَ قَاتَلُوا إِنْخَذَ
اوڑتاکہ ان لوگوں کو ڈرائے جو یوں کہتے ہیں
اللَّهُ وَلَدًا مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ
کہ (نحوذ بالله) اللہ تعالیٰ اولاد رکھتا ہے تو
وَلَآءِ بَأْيَهُمْ كَبَرَتْ كَلِمَةٌ تَخْرُجُ
اس کی کوئی دلیل ان کے پاس نہیں ہے۔
بڑی بھاری بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے۔
وَمِنْ آفَوَاهِهِمْ۔ (کھف ۱)

اس آیت میں قرآن نے قول انْخَذَ اللَّهُ وَلَدًا کو کلمہ کہا ہے۔

(۲) قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَاوُنُوا
آپ فرمادیجئے کہ اہل کتاب آؤ۔ ایک ایسی بات
إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءْ مَبْيَنَنَا وَبَيْنَنَا كَحْ
کی طرف جو کہ ہم سے اور تمہارے درمیان
آن لَّا تَعْبُدَ إِلَّا اللَّهُ وَلَا تُشْرِكَا
اوہ کسی کی عبادت نہ کریں اور اللہ تعالیٰ کی کیا کہ
يَهْ شَيْئًا وَلَا يَتَخَذَ بَعْضًا بَعْضًا
کسی کو شریک نہ ٹھپرائیں اور ہم میں سے
أَرْبَابًا مِنْ دُوْنِ اللَّهِ ط (آل عمران)
کوئی کسی دوسرے کو رب سرقار نے اللہ کو چھوڑ۔

طرح ہو گا حالانکہ مجھ کو کسی بشرطے ہاتھ نہیں
لگایا اور نہ میں بدکار ہوں فرشتے نے کہا
یوں ہی ہو جائے گا تمہارے رب نظر یا
ہے کہ یہ بات مجھ کو آسان ہے اور (اس طور
پر اس لئے پسیدا کریں گے) تاکہ اس فزند
کو ہم لوگوں کے لئے ایک نشانی اور رحمت کا
سبب بنائیں اور یہ ایک طشدہ بات ہے۔
اس سے صاف ظاہر ہوا کہ قرآن کی اصطلاح میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام "کلمۃ اللہ"
اس لئے ہو گئے کہ ان کا اس طرح پسیدا ہونا ایک امر مقدر اور طشدہ بات تھی۔

کلمۃ اللہ اور بائیبل [بائیبل کے عربی ترجمہ میں بھی ایسی آیات موجود ہیں جن میں^۱
کلمہ کا دہی مفہوم ہے جو قرآن کا مفہوم ہے یعنی کلمہ یعنی
بات، حکم اور امر مقدر۔
چند شایں ملاحظہ ہوں۔
(۱) امور الثالث والعشرون آیت ۶
بِكَلْمَةِ الرَّبِّ صُنْعَتِ السَّمَوَاتِ۔ اللہ کے لئے سے آسمان بنے۔

(۲) اخبار الایام الاول باب، آیت ۳

حلت کلمۃ اللہ علی تاثان النبی۔ اللہ کا کلمہ تاثان نبی کے پاس پہنچا۔
(۳) کتاب ہوسیع باب اول۔
کلمۃ الرب التی صارت الی ہوسیع۔ اللہ کا کلمہ جو ہو سیع کے پاس پہنچا۔

يَسْسَنِي بَشَرًا وَلَهُ أَكْبَرْيَا
قَالَ لَذِكْرِي قَالَ رَبِّكَ هُوَ
عَلَى هَيْنِ وَلِيَجْعَلَهُ أَيْتَهُ لِلنَّاسِ
وَرَحْمَةً مِنَّا وَكَانَ أَمْرًا قَصْصَيَا۔
(مریم ۲)

52
یعنی کافروں کا دوزخی ہونا اللہ کے نزدیک ایک امر ثابت ہے اس کے لئے
حَقَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ ارشاد فرمایا گیا ہے۔
وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا اور ہم نے ان لوگوں کو جو بالکل کمزور شمار کئے
جاتے تھے۔ اس سرزین کے پورب اور پچھم
كَالْكَبَنَادِيَا جس میں ہم نے برکت رکھی
ہے اور آپ کے رب کی جعلی ہاتھی اسرائیل
كَلِمَةُ رَبِّكَ الحُسْنَى عَلَى بَيْنِ
إِشْرَائِيلَ۔ (اعراف ۱۶)
گویا بھی اسرائیل کا صبر کے باعث مصریوں کے مقابلہ میں کامیاب ہونا اور زمین کا اراضی
بننا اللہ کے نزدیک ایک ہونے والی بات تھی جو ہو کرہی اسی کو **حَكْلِمَةُ رَبِّكَ**
الْحُسْنَى سے ظاہر فرمایا۔

اہل فتنہ اپنے تم درستکشی کی وجہ سے ایمان نہ لائیں گے یہ بات اللہ کے نزدیک
مسلم ہے اسی کو حقت کلمۃ رَبِّكَ سے یوں ادا کیا۔
لَذِكْرِ حَقَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ عَلَى
اسی طرح آپ کے رب کی بیوی (ازلی)، بات کہ ایمان
الَّذِينَ فَسَقُوا أَنْهَمُهُ لَا يُؤْمِنُونَ۔
(یونس ۲)

ان تمام تشریحات کے بعد قرآن پاک کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمۃ اللہ کئے
کا مقصد واضح ہو جاتا ہے یعنی بغیر آپ کے پسیدا ہونا علم الہی میں ایک طشدہ بات تھی۔
اسی طشدہ بات کو قرآن پاک نے (امر مقتضی)، کہہ کر بالکل صاف کر دیا ہے غیرہا۔
وَالَّتَّهُ أَنِي يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَلَمْ حضرت مریم کہنے لگیں بھلا میرے لڑکا کس

(۳) لوقا باب ۷ آیت ۳۱

اللہ کلمہ یوحنا بن زکریا۔
حلت کلمة الرَّبِّ علی یوحنّا بن زکریا کے پاس پہنچا۔

کلمۃ اللہ اور کلمہ تکوین | اس سلسلہ میں یہ امر بھی ذہن نشین کر لینے کے قابل ہے کہ مفسرین عموماً کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر جواز اگاتے تھے کہ حضرت مریم (نَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْهُ) مرتکب حرام ہوئی تھیں اور حضرت عیسیٰ نَعُوذُ بِاللَّهِ وَبِرَبِّ الْجَمَ�عَ تھے۔ اس الزام کو دو فراز کرد و فویں کی پاکی اور طہارت کے اطمہار کیلئے اللہ تعالیٰ نے انکو پیدائش کے طریق کو پانچا حلکت قدری اور اپنی جانب سے بخوبی ہوئی روح زندگی فرمایا اور حضرت مریم عکی نسبت اشارہ فرمایا۔
 وَمَرْيَمَ بَنْتَ عَمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ اور مریم بنت عمران جس نے اپنی شرمنگاہ کی
 فَرِجَّهَا فَنَفَّخْنَا فِيهِ مِنْ رُّوْحِنَا محافظت کی، پس پھونکا ہم نے اس میں اپنی
 وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَ اس سے اور مانستی تھی اپنے رب کی باتوں کو
 كُنْتُبِهِ وَ كَانَتْ مِنَ الْقَانِتِينَ۔ اس کی کتابوں کو اور تھی وہ فرماتے تاروں
 میں سے۔

(۱۲)

”مستشرقین بیرون پر“ جن کے فضل و کمال کا سکتہ دلوں پر بیٹھا ہوا اور جن کی تلاش و تحقیق کا رعب دماغوں پر چھایا ہوا ہے۔ وہ اسلام کی عداوت میں کبھی ایسی عامیانہ اور جاہلائی روشن اختیار کرتے ہیں جس پرستی معلومات والا انسان بھی ہنسنے خیز ہیں وہ سکتا چاہنے میم شہور جو من محقق و مستشرق نولی طبیکی جس کے علی افلام کا یہ عالم ہے کہ وہ قرآن پاک کو (نَعُوذُ بِاللَّهِ) تصنیف محمدی بتلاتا ہے۔ انساً یکلپو پیدیا یا آفت بریانیکا میں قرآن مجید پر ریویو کرتے ہوئے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لکھا ہے کہ

لَهُ بَلْدَهَا مِنْ ۹۰۰ طَبْعَ يَازِدْ بْنِمْ كِيرَجْ يُونَوْرَى۔

(۱۲) لِهِ الْغُورُ الْكَبِيرُ حِثْ شِرْك

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن پاک نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا کلمہ اس لئے نہیں کہا ہے کہ وہ اللہ کی صفت کلام ہیں جو ذات اہمی کے ساتھ قائم ہے، یا ذات اہمی میں ہیں یا ذات اہمی ہیں جیسا کہ عیسیٰ یوں کا بیان ہے بلکہ اس لئے کہا ہے کہ جس طرح وہ حضرت مریم عکی کے پیٹ سے متتنشی اشکل میں پیدا ہوئے۔ یہ پیدائش اللہ تعالیٰ کا امر مقدر تھا جس کا طہور حکم اہمی سے ہوا۔

اس تعبیر میں ایک لفظ (یغاث) ہے جو اجس کا معنی ہے یا اگلی ہے کہ بارش ہوگی۔ جمن ”مشرق“ کے نزدیک مصر کے سلسلہ میں بارش کا ذکر نہ عذیل اللہ صاحب قرآن کی بے خبری کی دلیل ہے۔

بوخت عقل ریجرت کہ ایس چہ بوابی ہی است

بے خرا نسان کو خدا نے علم و خیر کے کلام پر تنقید کی جرأت؟ ذیل کی سطروں میں اسی تنقید کی اصل حقیقت آشکاراً کی گئی ہے۔

(۱) اس سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ ”یغاث“ کے معنی صرف پانی بر سخے کے نہیں ہیں۔ مفسرین کی ایک جماعت کہتی ہے کہ غیث (معنی بارش) سے مشتق نہیں ہے بلکہ اس کا مادہ غوث ہے جس کے معنی ”فریادِ ری“ کے ہیں یعنی اس قحط کے بعد ایسا سال آئے گا جس میں لوگوں کی فریادِ ری ہوگی اور قحط دور ہوگا۔ اس قحط کے خاتمہ کا سبب بارش ہوگی۔ یا نیل کا سیلا ب؟ اس کا بیہاں کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

روح المعلّمین میں ہے۔

ای یصیبہ حمیث ای مطر کما قال	یعنی ان کو پانی پہنچے گا جیسا کہ ابن عباس
ابن عباس و مجاهد والجمهوُر فھو	مجاہد اور جمہور نے کہا ہے اس وقت
اس کا مادہ غیث ہوگا اور کہا گیا	من غاثِ الثلاثی الیا و قیل هو
ہے کہ اس کا مادہ غوث ہے یعنی فریادِ ری	من الغوث ای الفرج بقال اغا ثنا
اور میمت کا دور کرنا کہا جائیں گا اسی اثنے	الله تعالیٰ اذ امددنا يرقم المکاره
جب کہ اللہ ہماری میمتوں کو دور کر دے۔	حین اظللتنا فهو رباعی

”عرب سے تو انہیں واقفیت تھی لیکن پیر و بن عرب کا جہاں ذکر کرتے ہیں وہاں ان کی بے خبری (لفظ کا اصلی ترجیح جمالت ہے) کی پرده دری ہو جاتی ہے چنانچہ مصر کی زرخیزی کو جہاں کہ بارش تقریباً انہیں دیکھی جاتی ہے وہ دریائے نیل کے سیلا ب کے بجائے بارش پر مخفف رکھتے ہیں۔“

واقعہ کی اصل صورت یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام جب قید خانے میں تھے تو مصر کے بادشاہ نے خواب دیکھا کہ سات موٹی گائیں ہیں اور سات دبلي گائیں موٹی کو نگل گئیں اور سات شاداب بالیں ہیں اور سات خشک، خشک بالوں نے بسرا کو کھایا۔ شاہ مصر کے خواب کی حضرت یوسف علیہ السلام نے تعبیر دی جس کو قرآن پاک نے ان الفاظ سے بیان فرمایا ہے:-

قَالَ تَزَرَّعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَأَبَادَ
فَمَا حَصَدُتُمْ فَدْرُوهُ فِي سُنْبِلِهِ
إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا تَكُلُونَ طَشَّ يَا قِيَةُ
مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ سَبْعَ شَدَادِيَّاً كُلُّنَّ
مَا قَدَّ مُتَمَّلِّهُنَّ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا
تُخْسِنُونَ ثُمَّ يَا قِيَةُ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ
عَامٌ فِيهِ لِيَغَاثُ النَّاسُ وَ فِيهِ
يَعْصِرُونَ۔ (یوسف - ۶)

بھی نہ پھوپھوں گے۔

واوی۔

قاضی بیضاوی کہتے ہیں لہ۔

یمطرون فيه من الغیث اد
غوث ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ غوطان
سے دور کیا جائے گا ان کی فریاد سی ہوگی۔

شاعبی کی جواہر المحسان فی تفسیر القرآن میں ہے۔

جائز ہے کہ غیث سے ہو جیسا کہ ابن عباس ش
قول ابن عباس و جمہور المفسرین۔

ای یسطرون و جائز یکون من
اسا لهم اللہ اذا فرج عنهم ومنه
کی شکل دیکھ جائے گی۔

(۲) اور اگر عام مفسرین کے مطابق بارش ہی کے معنی لئے جائیں تو بھی
فضل مستشرق کا یہ دعویٰ کہ مصر میں بارش بالکل نہیں ہوتی ہے، غلط ہے۔ بارش
کم ہی سیکن اس کا مطلقاً انکار خلاف واقعہ ہے۔

یعقوبی کتاب البلدان میں کہتا ہے کہ مصر میں سواحل پر کس قدر بارش ہوتی ہے۔
الحضارة المصرية میں ہے کہ یہ کہنا ہرگز صحیح نہیں ہے کہ وادی نیل بارش سے محروم
ہے۔ اسی مارسٹن وی آسپرورڈ اسکھ کے جغرافیہ عالم میں ہے۔

لہبیضاوی ج اوں ۳۹۹ ملکہ جواہر المحسان ج ص ۲۶۳ ملکہ کتاب البلدان ص ۳۴۳ لکھے الحضارة

المصری ص ۱۱۸ جغرافیہ عالم ج ۲ ص ۱۷۳ حیدر آباد۔ تقویم البلدان ص ۱۱۸

”بارش بیہاں بہت ہی کم یعنی قاہرہ میں ایک اپنے سالانہ اور اسکندریہ جو سمندر سے
ستقبل واقع ہے ۱۸ اپنے سالانہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔“

(۳) مصر کے وہ مقامات جہاں فراعنة مصر کا قیام تھا ان کا بارانی ہونا تو بہر حال
ثابت ہے چنانچہ مصر کے سواحل اور قاہرہ جو ساحل دریائے نیل پر چودہ میل مریع رقبہ
میں آباد ہے دہاں بارش کا ہونا معلوم ہو چکا ہے، تایخ سے معلوم ہوتا ہے کہ فراعنة مصر
کا قیام قاہرہ سے قریب ہی منفَت اور عین شمس میں رہا کرتا تھا۔

ابوالفدا کی تقویم البلدان میں ہے کہ عین شمس کو مدینہ فرعون کہا جاتا ہے اور
یہ قاہرہ سے نصف مرحلہ پر واقع ہے۔

یاقوت نے مجم البلدان میں منفَت کو فرعون کا شہر بتلایا ہے اور بیہاں کے شاہ قریب
کے سلسلے میں لکھا ہے کہ یہیں حضرت یوسف علیہ السلام کا مکان تھا۔ یہیں فرعون کا
قیام بھی رہا کرتا تھا اور یہیں فرعون کا عین شمس تھا اور اس وقت فسطاط کا جو محل و قلع
ہے وہ عین شمس اور منفَت کے درمیان ہے۔

اصل یہ ہے کہ عین شمس ایک تکلیف تھا لگ اس کی زیارت کو آتے تھے پھر بیہاں
آبادی قائم ہو گئی اور فترہ رفتہ اس آبادی نے شہر کی حیثیت اختیار کر لی ورنہ یہ منفَت
سے الگ نہیں تھے۔

خطاط مقیری میں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے حضرت یعقوب علیہ السلام
اور پوپے خاندان کو جس میں ۳۷ مرد اور عورتیں شامل تھیں فرا اور عین شمس کے درمیان
ٹھہرایا تھا اور بیہاں کی زین بہت شا دا بکھے ہے

لہبیضاوی ج ۱۱۸ ملکہ جواہر المحسان ج ۲۶۳ ص ۱۸۱ تک مقیری ج اص ۳۱۸ تک مقیری ج اص ۱۱۸۔

عبد حاضر کے مشہور عالم علامہ سید رشید رضا مر حوم جن کی پوری زندگی تقدیماً مصر، ہی میں گزری وہ اپنی تغییرات میں فرماتے ہیں کہ مصر کو بارش کے پانی میتھنے نہیں کیا جاسکتا۔ کہا جاتا ہے کہ مصر کی زندگی بارش سے نہیں بلکہ نیل کے پانی سے ہے حالانکہ خود نیل کا پانی بارش ہی کا مامنون ہے۔ نیل کا فیضان اور اس کی کمی درحقیقت ان مقامات کی بارش پر مختصر ہے جہاں سے نیل میں پانی آتی ہے اس ضمن میں علامہ مر حوم نے قرآن یاک کی آیت نقل فرمائی ہے۔

**اُنْذَلِ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَلَّكَهُ يَنَانِي بَيْعَ
فِي الْأَرْضِ (زَمْرٌ)**

اس کے بعد فرمایا کہ وہ چھوٹے دریا جو نیل کے "ینابیع" ہیں وہ بارش ہی کے پانی سے ہیں یہاں فرعون کا وہ مقول بھی پیش نظر کھنا چاہئے جس کو قرآن پاک نے نقل کیا ہے۔

آلیس بی ملک مفت و هدیه الانفار
ای میری قوم! کیا صفر کی سلطنت میری نہیں
تتجزی میں تختی۔
ہے اور یہ نہیں میری پائیں بہر سی ہیں)۔

اس سلسلہ میں قرآن پاک کی دوسری آیت بھی قابل توجہ ہے۔
 قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے تھا
 ہے کہ ہم ان مقامات پر پانی پہنچاتے ہیں جہاں بارش نہیں ہوتی یا اگر ہوتی ہے تو اس
 قدر کم کہ اس سے پورا نفع نہیں اٹھایا جا سکتا ہے۔ فرمایا ہے۔

أَوْلَمْ يَرَوْا نَاسًا سُوقُ الْمُكَاءِ إِلَى
كِيَا انہوں نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ ہم

اب بھی عین شمس قاہرہ کے مضافات میں موجود ہے مسلمان اس کو عنون اور یلوپی لوگ ٹیبلوپس کے نام سے یاد کرتے ہیں اب یہاں بڑے بڑے مکانات اور شاندار ٹولی ہیں، قاضی ولی محمد صاحب اپنے سفرنامہ مصر ۱۹۲۳ء میں لکھتے ہیں۔

”کہتے ہیں کہ اس جگہ کو حضرت موتیٰ کی اقامت کا شرف حاصل ہوا تھا اور فرعون کا محل بھی یہیں تھا اور یہیں عزیز مصر کے بیگلے میں زینخار ہتھی اس جگہ کوئی ہیکل شیخی تھا جہاں آفتاب پرستی ہوتی تھی۔ لعلے

ان تفصیلات سے معلوم ہے کہ فراعنة مصر قاہرہ کے قریب ہی آباد تھے اور وہ بیان کیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی تعبیر خواب میں اگر بارش کا ذکر کیا جائے تو نہ کوئی خلاف واقعہ بات نہیں ہے۔

(۲) محقق مستشرق نے مصر کی زرخیزی کو دریائے نیل پر منحصر رکھا ہے۔ لیکن اس پر غور نہیں کیا کہ خود دریائے نیل کا پایانی بھی بارشی کے پایانی کا نتیجہ ہے۔

یعقوبی کا بیان ہے کہ مصر کے اور اس کے دیہاتوں کا کام نیل سے چلتا ہے اور نیل کے پانی میں بارش کے اس پانی سے زیادتی ہوتی ہے جو گری میں بہتا ہے۔
الحضارۃ المصریہ میں ہے۔

اب یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے کہ نیل کا نیفان اُس بارش
کا نتیجہ ہے جو بارش مایپھ میں وسط افریقہ میں ہوتی ہے جہاں کہ دریائے
نیل کا منبع ہے اور وہاں سے مصر کی طرف یہ پانی سر بزرگی اور شادابی
لے کر آتا ہے۔

الْأَرْضُ الْجَرْزُ فَتَخْرُجُ بِهِ زَرْعًا
تَأْكُلُ مِنْهُ الْعَامُهُ وَالْفَسُهُمُ
أَفَلَا يَتَصَرُّونَ - (سجدہ ۳)

حکم اقتادہ زمین کی طرف پانی پہنچاتے ہیں۔ پھر اس کے ذریعے سے کھیتی پیدا کرتے ہیں جس سے ان کے مواثی اور وہ خود بھی کھاتے ہیں تو کیا وہ دیکھتے نہیں ہیں ۹۔

مفسر ابن حجر ہر نے حضرت عبداللہ بن عباس سے "ارض جرز" کے یہ معنی نقل کئے ہیں۔

قَالَ الْجَرْزُ الَّتِي لَا يَمْطِرُ إِلَّا مَطْرًا
لَا يَغْنِي عَنْهَا شَيْئًا إِلَّا مَا
يَا تِيهَا مِنِ السَّيْوِلِ -

جز روہ ہے جہاں ناکافی بارش ہوتی ہو۔ سوا اس کے جو پانی سیلاب سے پہنچ جائے۔

حافظ سیوطی حسن المحافظہ میں کہتے ہیں۔

"ایک جماعت کے نزدیک ارض جرز سے مراد مصر کی سر زمین ہے"
حافظ ابن کثیر اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

مفسرین عموماً ارض جرز کیلئے مثال میں مصر کا نام پیش کر دیتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سے مراد مفعن "مصر" ہے بلکہ ارض جرز میں سے مصر بھی ہے۔ مفسرین ارض جرز کا ہونا قطعی ہے ہاں کی زمین کی حالت یہ ہے کہ اگر بارش حسب فرورت ہو تو مکانات منہدم ہو جائیں اسلئے اللہ تعالیٰ وہاں بارش کے بجائے اس پانی کو لے جاتے ہیں جو بلا دھبہ میں برستا ہے۔

اسی مفہوم کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اپنے رسالہ عرشیہ اور منہاج السنۃ میں بیان کیا ہے۔

منہاج السنۃ میں ابن تیمیہ کے الفاظ یہ ہیں۔

ارض جرز میں اتنا پانی نہیں بستا جو اس کا رض مصروف امطرت مطر المعتاد کے لئے کافی ہو جیسے مصر کی زمین کو اگر معمولی بارش ہو تو وہ اس کو کافی نہیں، اس لئے کہ مصر کی زمین کچھ بڑے والی ہے اور اگر زیادہ پانی بر سے ملا جائیں بارش کے ماچ بیرونی ہوئی ہے تو مکانات برباد جائیں۔ پس اللہ کی حکمت اور رحمت ہے کہ ایک در مقام پر بر ساتا اس کی مشیت اور اس کی حکمت پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔

کس قدر لوچپ بات ہے کہ جو حیز نولائیکی کے نزدیک نوذر باشد صاحب قرآن کی بے خبری پر دلالت کرتی ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ اسی سے خدا کے علم، اس کی قدر مشیت اور اس کی حکمت پر استدلال کرتے ہیں۔

یہ امر بھی خاص طور سے لائق توجہ ہے کہ یہ قحط مصر ہی میں نہ تھا بلکہ اس کے اثرات

دور دوستک تھے، برادران یوسف علیہ السلام کا غلہ کیلئے مصر آنحضرت قرآن میں ذکور ہے۔
تورات میں بھی ان کا کنگاں سے مصریک غلہ کیلئے آنا مصرح موجود ہے۔
”نصرت کنگاں بلکہ اور بہت سے ملکوں کے لوگ غلہ کے لئے مصیر
آتے تھے“

(پیدائش باب)

عرب سے علاقہ یمن کے جنوب تک اسکے اثرات تاریخ سے ثابت ہیں چنانچہ ریونڈ فارسٹر کے انگریزی ”تاریخ جزیرہ عرب“ میں ابن ہشام کے حوالہ سے دیج ہے کہ ملک یمن میں سیلاب کے اثر سے ایک قبر کھل گئی جس میں ایک عورت کی لاش نظر آئی اُس کے گلے میں موتویوں کے سات گکوند ہاتھوں اور پیروں میں بازو بندرا اور سات چھٹے بھی تھے۔ ہر ہر انگلی میں ٹیکنے کی میش قیمت انگوٹھی اور سر ہانے زرداں سے لبریز ایک ایک صندوق پر تھا۔ قبر میں ایک کتبہ بھی ملا۔ جس میں پہلے فقرے کے بعد پانچ اشجار درج ہیں۔ اس کی نقل حسب ذیل ہے۔

بِاسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
تَبَرَّكَ نَامَ سَلَامٌ اللَّهُ أَعْلَمُ
(۱) اَنَانَاحَهُ بَنْتُ ذِي شَقْرٍ بُنْتُ مَا
مِنْ تَاجِبِنَتْ ذِي شَقْرٍ ہُوَ مِنْ نَّانِ شَاهِي
بِيرَنَا الَّى يُوسُفَ فَابطأ عَلَيْنَا
دَارِوَغَهُ كَوْيُوسُفَ كَهَا كَهَا پَهْرَجَبُ وَابِي
مِنْ دِيرِ ہُوَ تَوْمَنَ نَانِ خَاصَ كَوْسِجا۔
فَبَعْثَتْ لَادِقَ،
(۲) بَمَدْ مَنْ وَرَقْ لَتَانِي بَمَدْ
چَانِي کَيْ اِيكَ مَقْدَارَ دَيْكَرَ کَهَا عَوْضَ
مِنْ طَهِينَ فَلَمْ تَجَدَ لَا فَبَعْثَتْ بَمَدْ
مِنْ آَمَّهَ کَيْ اِيكَ مَقْدَارَ لَائَهَ پَهْرَجَبُ وَهَنَّ

- سکانو پھر بیٹا نے سونا دے کر بھیجا۔ من ذهب۔
- (۳) فلم تجده فبعثت بهد من بمحرى جب اس سے بھی نہ مل سکا تو پھر بیٹا نے موتی
سمیجے اور جب اس سے بھی نہ مل سکا تو بیٹا نے فلحت تجده فامررت به فظحن۔
- ان موتویوں کو پیوا اولا۔ دکی کام نہ آسکے سواب میں یہاں دفن ہوتی
- (۴) فلم انتقم به فاقتفلت فمن سمع فلیر حسنى: ہوں۔ جو کوئی میری خبر پڑائے اسے چلھئے کہیے اور ترس کھائے۔
- (۵) وَايْه امْرَأَةٌ لَبَسَتْ حَلِيَّا مِنْ حَلِيَّتِ فَلَمْ مَاتَتْ إِلَّا مَيِّتَتِي۔ اور اگر کوئی عورت میرے ان زیوروں پر ٹھن کرے اور انہیں پہننا چاہے تو اس کو میری ہی جیسی تو خصیب ہو۔
- اس کتبہ سے معلوم ہوا کہ یمن تک اس نقطہ کے اثرات تیقینی تھے تورات تو صراحتہ اس کی عالمگیری کی قائل ہے۔
- (۶) اور سات برس ارزانی کے جزو میں مصر میں تھے، آخر ہوئے اور گرانی کے سات برس جیسا کہ یوسف نے کہا تھا آنے شروع ہوئے۔
- (۷) اور سب زمین میں گرانی ہوئی۔ پر ہنوز مصر کی ساری زمین میں روئی تھی۔
- (۸) پر جب ساری زمین مصر بھوک سے ہلاک ہونے لگی تو خلق رومی کیلئے فرعون کے آگے چلائی۔ فرعون نے سب مصریوں سے کہا کہ یوسف کے جاؤ وہ جو توہیں کہے کرو۔
- (۹) اور تمام روئے زمین پر کال تھا اور یوسف نے زمین کے کھنکھوں کے مصریوں کے ہاتھ بیچے اور مصر کی زمین پر کال بہت بڑھا (۱۰) اور سالے ملک مصر میں یوسف نے

مول لیئے آئے کیونکہ سب ملکوں میں سخت کال تھا۔
ان حالات سے بیرون مصر قحط کے اثرات کا جب ثبوت موجود ہے تو مسئلہ
اور واضح ہو جاتا ہے اسلئے کہ الگ مصر کو باش سے محروم بھی تسلیم کر لیا جائے تو سارا عالم تو
باش سے محروم نہ تھا اور قرآن پاک میں "یغاث" کے ساتھ "الناس" کا لفظ بھی ہے صرف
اہل مصر کی تخصیص نہیں۔

(۷) اس موقع پر نفس آیت پر بھی ایک نظرِ الناچاہتے اور قرآن پر تنقید کے بجائے
اس کے اعجاز و بلاغت اور اس کی صداقت کا اعتراف کرنا چاہتے۔

تو ریت کی منقولہ بالا آیت سے معلوم ہو چکا ہے کہ جب سایہ عالم میں لوگ
بھوک سے پریشان تھے، اس وقت مصیرِ خوشحالی تھی۔ آیت یہ ہے۔

"او رس ب زمین میں گرانی ہو گی پر ہنوز مصر کی ساری زمین میں روٹی ہو گی"

یہ خوشحالی درحقیقت حضرت یوسف علیہ السلام کی تعبیرِ خواب کے طفیل میں تھی جس

میں آپ نے ارشاد فرمایا تھا۔

ثُرَّرَ عُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَأْبَأْ فَهَا
حَصَدَ تُمْ فَذْ رُؤْكَافِ سُنْبُلِهِ
إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا تَأْكُلُونَ (یوسف)

تم سات سال متواتر غلم بنا پھر جو فصل
کاٹوں کو بالوں میں رہنے دینا اگر تھوڑا سا جو
تمہاں سے کھانے میں آتے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی اس تنبیہ کے باعث اہل مصر کو کسی قدر غلام مل گیا
نخاود دوسرے ملکوں ولے چونکہ بالکل بے خبر تھے اسلئے وہ کوئی انتظام نہ کر سکے۔ اب
قابل غور امر یہ ہے کہ اس پوری آیت میں (یناث، فریدری ہو گی، یا بارش ہو گی) اور
لئے پیدائش پائیں۔

یعصر و ن (شیرہ پھوڑیں گے) کے سواب جتنے صیغہ ہیں وہ سب حاضر کے ہیں (تزویون)
تم غلہ بونا حصد تم فصل کاٹو۔ تاکوون تم کھاؤ۔ (تھیثون) تم جمع کرو گے گویا
ان مخاطب صیغوں کا تعلق صرف اہل مصر سے ہے اور اسی لئے وہ نسبتاً فتح میں سے اور ان
کے بعد جو صیغہ ہیں یعنی یناث اور یعصر و ن وہ غائب کے صیغہ ہیں۔

یہ التفات بے سبب نہیں ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بارش یا فریدری کا تعلق
چونکہ دوسرے ملکوں سے بھی تھا اس لئے یہاں غائب کے صیغہ استعمال کئے گئے تاکہ مفہوم
یہی عموم پیدا ہو اور نولد کی جیسے محققین کو یہ شہہ نہ پیدا ہو کہ مصر کی زمین تو بارانی نہیں
ہے اسلئے وہاں بارش کیسے ہو سکتی ہے اور کاشت نیز غلہ کے جمع کرنے کا تعلق چونکہ
صرف اہل مصر سے تھا اسی لئے وہاں خطاب کے صیغہ استعمال کئے گئے ہیں۔

(واللہ اعلم بالصواب)

لئے التفات علم حانی بیان کی ایک مطلوب ہے جو کامنہ ہے کہ ایک ہی فمن کی گفتگو میں صیغوں اور طرزِ خطاب
کا تغیر و تبدل مثلاً ابھی گفتگو میں حاضر کے صیغہ استعمال ہو سہے تھے یا کیا غائب یا مخلکم کے صیغہ استعمال
ہونے لگے۔ ابھی اضافی کا استعمال تھا کہ مفارع کا استعمال ہونے لگا و مثل ذالث۔ یہ علم بلاغت کا
ایک اہم شہر ہے اور قرآن پاک کے التفات میں بے انہی نکات ہیں جو علم بلاغت سے پچھے رکھنے
والوں پر پوشیدہ نہیں ہیں۔

پندر صویں صدی ہجری کے نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظلہ العالی کا ایک عظیم تھفہ
ایک ہی حیاتتہ آفرینی ہے پیغام

تاریخ دعوت و عزیمت

(چھ حصوں میں)

حصہ اول : پہلی صدی ہجری سے لے کر ساتویں صدی ہجری تک عالم اسلام کی اصلاحی و تجدیدی کی کوششوں کا تاریخی جائزہ، نامور مصالحین اور ممتاز اصحابِ دعوت و عزیمت کا مفصل تعارف، ان کے علمی کارناموں کی روادار اور ان کے اثرات و تاثیر کا ذکرہ۔

حصہ دوم : جس میں آٹھویں صدی ہجری کے مشہور عالم و مصلح شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؓ کی سوانح حیات، ان کے صفات و کمالات، ان کی علمی و تصنیفی خصوصیات، ان کا تجدیدی و اصلاحی کام اور ان کی اہم تصنیفات کا مفصل تعارف اور ان کے ممتاز تلامذہ اور منتسبین کے حالات۔

حصہ سوم : حضرت خواجہ میمن الدین جشتیؓ، سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اویسیؓ، حضرت محمد شیخ شرف الدین یحییٰ نیمیریؓ کے سوانح حیات، صفات و کمالات، تجدیدی و اصلاحی کارنامے، تلامذہ اور منتسبین کا تذکرہ و تعارف۔

حصہ چہارم : یعنی بیجنگی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی راء ۹۰۴ھ کی مفصل سوانح حیات، ان کا عہدہ اور ساحوں، ان کے عظیم تجدیدی و اصلاحی کارنامے کی اصل نوعیت کا بیان، ان کا اور ان کے سلسلے کے مشائخ کا اپنی اور بیجنگی صدیوں پر گھرا اثر اور ان کی اصلاحی و تربیتی خدمات۔

حصہ پنجم : تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ مدحت دہلویؓ، احیائے دین، اشاعت کتاب و سنت، اسرار و مقاصد شریعت کی توضیح و تبیغ۔ تربیت و ارشاد اور ہندوستان میں ملت اسلامی کے تحفظ اور شخص کے لئے ان عہدہ افرین کوششوں کی روادار، جن کا آغاز حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؓ اور ان کے اخلاف و خلفا کے ذریعے ہوا۔

حصہ ششم : حضرت یید احمد شہیدؓ کے مفصل سوانح حیات، آپ کے اصلاحی و تجدیدی کارنامے اور غیر منقسم ہندوستان کی سب سے بڑی تحریک جہاد و تنظیم، اصلاح و تجدید اور احیائے فلاح اور تاریخ دو جلدیں میں (مکمل)

ناشر، فضل ربانی ندوی

مجلس نشریات اسلام ۱۔۲۔ ناظم آباد میشن، ناظم آباد کراچی ۱۱

مُفکرِ اسلام مولانا سید ابو حسن علی ندوی[ؒ] کی چند اہم شاہکار تصنیفات

نیو ہرنسٹ مکمل
دریشت کا ہبیس اور گردار
مرکز ایمان و مدارست
پرانے چار نئکل روز دن
اکان اریب
نقوشِ اقبال
کاروانِ دریشت
فتادیہت
تمیر ارشادیت
صریح پاکستان
املاجیات
سمیتے بائیں دل
کاروانِ زندگی مکمل
مذہب و تحدیں
دستورِ حیات
حیات عبد الحمیڈ
روشنخان انصویں
شمع پاکستان
یامسراغ زندگی
نامہ جلی کا ایب

تاریخِ دعوت و عزیمت مکمل رپورٹ
اسلام مراہنگیں اسلامیت اور معرفت کی کھدائی
اسانی دنیا پر مسلمانوں کے مروج و زوال کا اثر
نسبت بہوت اور اس کے کمال مقام عالمین
ذریائے کامل سے ذریائے پرمونگ
تذکرہ فضل الراسن عجیج شراؤ آبادی[ؒ]
تہذیب و تقدیم پر اسلام کے اثرات و احصاءات
تبیین و دعوت کا بہوار اسلوب
مغرب سے کو ماں صاف ہائیں
نی ریاض امریکی ایں صاف صاف ہائیں
جب ایستان کی ببارائی
مولانا گمراہیاں اور آن کی ریتی دعوت
چخار مقدس اور ستریۃ العرب
مصر ماڑیں رون کی تعمیم و تشرییع
ترکیب و احسان یا تصوف و سلوک
مطاعتِ قرآن کے جہادی اصول
سوائی شیعہ العدیث مولانا گمراہیاں[ؒ]
خواتین اور دین کی خدمت
کاروان ایمان و عزیمت
سوائی مولانا عبید الد قادر رائے پوری[ؒ]

ناشر، تفضل رئیس ندوی — فون ۶۲۱۸۱۴ - ۶۲۰۸۹۶

مجلس نشریاتِ اسلام، ناظم آباد نیشن، اے کے ہائی ایجاد کراچی ۱۶